جلد ۹۵ اگست ۱۹۸۱ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۵ | اگست ۱۹۸۱ء مطابق شوال ۱۴۰۱ھ | عدد ۶

قارئین ترجمان القرآن کی خدمت میں

عید مبارک

ادارہ ترجمان القرآن - لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن ——— ۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر : سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہِ صیام کی رحمتوں اور برکتوں کی گھٹا موتی برسا کر گزر گئی!

جب بھی کوئی گھٹا برستی ہے تو اس کے کچھ اثرات و نتائج بعد میں بھی باقی رہتے ہیں۔ اور ایک حدیث شریف کی رُو سے یہ بات زمین پر بھی منحصر ہے کہ وہ گھٹا کے فیضان کو کہاں تک سنبھال سکتی ہے۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے کہ وہ برکھا کو جذب کرتی ہے اور پھر اس کے اندر روئیدگی پیدا ہوتی ہے، گل و گیاہ نمودار ہوتے ہیں، غلے اور پھل ظہور کرتے ہیں۔ اس روئیدگی سے خلقِ خدا فیضان حاصل کرتی ہے۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے جو خود تو پانی کو جذب کر کے اس سے پھل پھول پیدا نہیں کر سکتی مگر پانی کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ اور پھر اس جمع شدہ پانی سے خشک موسم میں کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں۔ پانی کبھی تالابوں اور جھیلوں کی شکل میں جمع ہوتا ہے اور کبھی وہ زیرِ زمین جا کر کسی چٹان یا سخت ردّے کی وجہ سے سطح کے قریب ہی رک جاتا ہے اور مناسب راستہ پا کر چشموں کی صورت میں بہنے لگتا ہے۔ زمین کی ایک تیسری قسم ہے جو نہ خود پانی کو جذب کر کے روئیدگی دے سکتی ہے اور نہ کوئی آبی ذخیرہ محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس پتھریلی اور چٹیل زمین پہ پانی برستا ہے اور اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔

ماہِ صیام کی گھٹا سے جو بارانِ رحمت مہینہ بھر جاری رہی، اس کے متعلق آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی قلب و رُوح کی کیفیت تین قسم کی زمینوں میں سے کس قسم کی رہی۔

ایک احتساب تو وہ تھا جسے پورے ماہ رمضان میں قیامِ لیل اور صیام نہار کے ساتھ جاری رہنا تھا کہ آیا روزے کی صحیح ہیئت کے ساتھ ساتھ اس کی صحیح رُوح بھی کام کر رہی ہے اور آیا پوری زندگی صبر و تقویٰ کے زیرِ اثر ہے؟ اور ایک احتساب اب ماہِ رمضان کے گذر جانے کے بعد کرنے کا ہے کہ ہم نے اس سے کیا استفادہ کیا؟ عارضی کیا؟ اور مستقل کیا؟

روزے آپ نے رکھے۔ خدا جزا دے، تراویح پڑھی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، قرآن سے مشغولیت رہی، خدا آپ کو ایمانی نور عطا کرے۔ انفاق فی سبیل اللہ کیا، صاحبِ رزق برگ و بار ارزانی فرمائے۔ ان نیکیوں کے بعد بھی کچھ باتیں سوچنے کی ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ نفس کی جبلتوں، خواہشات اور ہیجانات پر قابو پا کر انھیں پابندِ حدود رکھنے کا جو تجربہ ہم آپ نے کیا ہے، اس کے نتیجے میں کیا ہم میں تھوڑی بہت مستقل یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں کہ ہم مرضیاتِ الٰہی کے تحت نفس کو جب جس چیز سے چاہیں روک دیں اور کہہ دیں کہ خبردار! ادھر قدم نہیں بڑھانا، اور جب مناسب سمجھیں اسے یہ اذن دے دیں کہ اچھا فلاں امر میں فلاں حد تک جا سکتے ہو، آگے نہیں! ہم آپ نے اپنی ذات کی کمان کرنے کی صلاحیت کس قدر پیدا کی؟ دُنیا میں کوئی تبدیلی لانے اور دوسروں پر کمانڈ کرنے کی شرطِ اوّل دینِ حق میں یہ ہے کہ اپنی ذات کی گردن آدمی کے پنجے میں رہے اور وہ اسے سمتِ عبودیت سے پھرنے نہ دے۔ نیز کبر و غرور سے اکڑنے نہ دے۔

انسان کی جبلتیں اور ہیجانات بڑے ہیجانہ مزاج کے ہوتے ہیں، وہ کبھی کبھی ایک ایسا طوفان اُٹھا دیتے ہیں کہ آدمی مقابلے میں قدم نہیں جما سکتا۔ عام قسم کے لوگ جن پر نہ ایمان کی گرفت ہو، نہ نماز روزے کے تربیتی عمل سے وہ آشنا ہوں، ان کی تو زندگی ہی ادنیٰ ذاتی خواہشات کے دائرے میں گھومتی ہے۔ اور اس کے لیے وہ ہر طریقہ اختیار کر لیتے ہیں — انسانوں کی اس قسم میں کتنے ہی عہدہ دار، تاجر، وکلا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب شامل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو خدا کا ذکر بھی کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی کرتی ہے، نماز کی بھی پابند ہے، روزے کا بھی اہتمام کرتی ہے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض بھی پورے کرتی ہے۔ اور بعض نوافل اور صدقات اور سماجی خدمات کے سلسلے میں مقام رکھتی ہے۔ مگر اس ساری زندگی کے ساتھ صرف ریا، مشرکانہ طریقے،

غیر اسلامی رسوم، ناجائز سفارش بازی، رشوت کا لین دین، سودی معیشت —— کبھی کبھی اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری جیسے کارنامے بھی اس کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ مریضانِ تضاد ہیں، اور انہوں نے دین کو سوجھ بوجھ اور سوچ بچار کے ساتھ قبول نہیں کیا، بلکہ خاندانی یا موروثی راستے سے یا تصوف کے کسی دائرے سے غیر شعوری طور پر اخذ کیا ہے۔

سوال ان سب کے لیے نہیں، یہ ہمارے آپ کے سوچنے کے لیے ہے کہ رمضان کے اُستاد نے جو سبق دیا تھا اُسے ہم نے کتنا یاد رکھا، اور کتنے کو عملی زندگی کا حصہ بنا لیا؟ کیا کوئی روکا ہوا حق ہم نے کسی کو ادا کیا؟ کیا کوئی مالِ حرام اپنے آپ سے الگ کیا؟ کیا کسی غیر قرآنی عقیدے اور کسی غیر اسلامی رسم اور کسی صریح بدعت کو چھوڑا؟ صدقہ و خیرات کا عالم کیا رہا۔ رمضان میں جو مصارف اُٹھے اور پھر عید کے لیے جو رقم لگائی گئی اس کا کتنواں حصہ خدا کی راہ میں خرچ ہوا؟ خدا کے دین کے لیے؟ اُس کے بندوں کے لیے؟ مہاجرین کے لیے —— ؟ کیا اقربا اور رفقا کے حلقوں میں کسی ٹوٹے رشتے کو بحال کر لیا؟ کوئی نفل، ذکر یا دعا، یا کوئی اور نیا سرمایۂ خیر ہمارے معمولات میں شامل ہوا؟

رمضان نے ہمارا رشتہ خاص طور پر قرآن سے جوڑا تھا؟ تراویح میں قرآن سنا گیا، روزہ داروں نے اپنے طور پر ختمِ قرآن کیا، قرآن کے درس کی محفلیں ہوئی ہوں گی، بہت سے حضرات نے استفادہ کیا ہوگا۔ اب یہ دَور گذار کر احتساب کرنا چاہیے کہ کیا ہمارا تعلق قرآن کے ساتھ رمضان کے بعد بھی باقی ہے؟ بعد میں بھی قرآن پڑھنے اور قرآن سننے کا سلسلہ جاری ہے؟ بعد میں بھی قرآن کے کسی حلقۂ درس میں شرکت برقرار ہے؟ یا کم سے کم تفسیر و ترجمہ کا مطالعہ ہوتا ہے؟

اگر یہ چیزیں ہیں تو جتنی ہیں، اتنا فیضان آپ نے رمضان سے مستقلاً حاصل کر لیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کو جس بڑے کام کے لیے اُٹھایا گیا ہے اور جس کے لیے نماز ہو یا ماہِ رمضان کے روزے یا دوسری عبادات، سبھی کے اندر ذہنی و اخلاقی تربیت کا سامان رکھا گیا ہے، اس کام کے سلسلے میں کیا اقدام ہوا؟

ہماری کام اقامتِ دین کی مہم ہے جس کا پہلا سرا دعوتِ حق (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) ہے اور جس کا آخری سرا جہاد ہے۔ بلکہ یہ سارا سلسلہ ہی جہاد ہے جس کا آغاز خدا پرستی کی طرف بلانے اور طاغوت سے روکنے سے ہوتا ہے، اور جس کی تکمیل خاک و خون میں تڑپ جانے سے ہوتی ہے۔

کیا آپ اس مہم کے سلسلے میں رمضان المبارک میں کبھی گھر سے نکلے؟ رشتہ داروں، دوستوں یا اجنبیوں سے کبھی کوئی باقاعدہ گفتگو کی؟ کسی کو کم سے کم روزہ داری کے لیے دعوت دی؟ تراویح کے لیے تیار کیا؟ کسی درسِ قرآن کے حلقے میں شرکت کی تلقین کی؟ اس بڑی دینی مہم کے لیے کبھی آپ نے اجتماعات کیے، اور ان میں مشورے سے کبھی لائحۂ عمل تیار کیا؟

لوگوں سے ربط رکھنے کے سلسلے میں کیا کبھی مصیبت زدہ مخلوق کے قریب ہوئے؟ اُن کے احوال سُنے؟ ان کی مشکلات کے حل میں کوئی مدد بہم پہنچائی؟ مریضوں کی عیادت کی، یا اُن کو کبھی دوا دارو کا انتظام کر دیا؟ کسی کو ہسپتال میں داخل کرایا؟ کسی ستم رسیدہ کو اپنے ہمدردانہ جذبات کے ذریعے سہارا دینے کی کوشش کی یا کسی کے لیے بطورِ خاص دعا کی؟ کسی کو ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کی؟

یہ رابطۂ عام ایسی دعوت کے لیے فضا کو تیار کرتا ہے جس پر آپ مامور ہیں؟

اقامتِ دین کی مہم کے سلسلے کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ ملک میں قیادت، حکومت کی مشینری اور اس کے مختلف ادارے، پرانے سیاسی لیڈر اور اُن کے گروہ، مذہبی فرقے، خصوصاً دینی اصول و اقدار میں فتنہ انگیزی کرنے والے خاص خاص عناصر، غیر مسلم اقلیتیں، مغرب پرست طبقے، پریس، ذرائع ابلاغ، بیرونی قوتیں جو جو کچھ کر رہی ہیں، اُن پر نظر رکھی جائے۔ اور جو چیزیں دین کے حق میں جاتی ہوں، ان کی تائید کی جائے اور جو خلاف جاتی ہوں اُن کی روک تھام کی جائے۔ اس کے لیے مطالعہ بھی کیا جائے، قلم سے بھی کام لیا جائے، گفتگوئیں بھی کی جائیں، چھوٹی چھوٹی مجالس بھی منعقد ہوں۔ حالات کی جو بھی لہریں اُٹھیں اُن کے متعلق علمبردارانِ دینِ حق کو باخبر بھی ہونا چاہیے اور مخالفانہ

رجحانات کا زور توڑنا بھی چاہیے۔

خاص طور پر جو مسائل جرائد میں زیر بحث آئیں یا جن کا عوام میں چرچا ہونے لگے، اُن پر پوری ذہنی تیاری کر کے جرائد اور عوام کے حلقوں میں دو طرفہ کام کیا جائے۔

جس کسی میں سچا جذبۂ اقامتِ دین ہوگا، یقیناً ماہِ صیام نے اس کے جذبے کو نئی توانائی دی ہوگی۔ ایسا کوئی بھی شخص اگر پہلے اپنے فریضہ میں سست گام بھی تھا تو اب اس کا ضمیر اُسے پوری رفتار سے کام کرنے پر مجبور کر دے گا۔

یاد رکھیے کہ رمضان المبارک کو تحریکِ اقامتِ دین سے گہرا تعلق ہے۔ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے اور اوّلین معرکۂ حق و باطل بھی اسی مہینہ میں ہوا تھا، جس میں کثیر التعداد مخالفین کے مقابلے میں مسلمانوں کا مختصر گروہ کامیاب رہا۔

رمضان میں شیطان زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے، مگر شیاطینِ انس کے ذہن و اخلاق کو شیطانی قوتیں اتنا بگاڑ دیتی ہیں کہ وہ شیطنت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور پھر اس رنگ کو پھیلانے کے لیے طرح طرح سے کام کرتے ہیں، اُن کے خلاف آپ نے کس حد تک کام کیا؟

زندگی کے باطل اور فاسد نظریات جو دینِ حق سے ٹکراتے ہیں، اُن کا زہر ہمارے معاشرے میں علم، تعلیم، ادب، صحافت، شاعری، ثقافت، اشتہارات اور ذرائع ابلاغ کے غلط استعمال کے ذریعے پھیلایا جا رہا ہے۔ اس زہر کا توڑ کرنے کے لیے آپ نے مختلف میدانوں میں خصوصاً اس خاص میدان میں جس میں آپ کی براہِ راست ذمہ داری ہے، کیا کام کیا؟

دولت پرستی، اسراف مستی، اور جرم و خیانت اور بے حیائی اور بے پردگی کے اُمڈتے طوفان کو آپ دیکھ رہے ہیں، کیا رمضان کی مقدس فضاؤں میں آپ کے اندر ایسا جذبۂ حق بیدار ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو آپ ان مفاسد کے خلاف کام کریں، اور نہیں تو اپنے گھر کے افراد میں، اپنے محبوں اور عزیزوں میں اور زیرِ اثر حلقوں میں دین کے اثرات بڑھائیں۔ آپ کم سے کم یہ فیصلہ تو کر لیں کہ بچوں کے رشتے کرتے ہوئے ایمان، اخلاق اور پردہ داری کو آپ اوّلین اہمیت دیں گے اور

اس کے لیے اپنے بچوں اور گھر والوں کے اذہان کو تیار کریں۔

بہرحال بڑا شیطان عارضی طور پر جکڑا پڑا رہا ہے، مگر خود انسانوں میں اس کے کارندے بے شمار ہیں اور وہ فکر، اخلاق، معاشرت، ثقافت، لین دین، دفتری نظام کے تمام دائروں میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم لوگوں کو کہاں تک احساس ہے؟

ایک ذمہ داری ہم پر مہاجرین افغانستان کی ہے جو ایک مخالفِ اسلام سپر پاور کی بہت وسیع فوجی جبریت کے ستم رسیدہ ہیں اور انھوں نے پاکستان کے پڑوسی مسلم ملک میں پناہ تلاش کی ہے۔ یہ بہادر اور غیور قوم جس وسیع پیمانے پر قربانیاں دے رہی ہے اور جس اسلامی جذبے کے زور سے بے سروسامانی کے باوجود اپنے سے سوگنا زیادہ بڑی قوت سے لڑ رہی ہے، یہ چیزیں مسلمانانِ عالم کے لیے سرمایۂ فخر ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ہماری ہمدردیاں افغانیوں کے ان بوڑھوں، بچوں اور مستورات کے لیے بڑی گہری ہیں، جو بے چارگی اور بے سروسامانی کے عالم میں سوائے ہجرت کے کوئی راستہ نہیں پا رہے۔

مصیبت کے مارے ہوئے ان مسلم مہاجرین سے محبت کرنا اور ان کے لیے اپنے اموال میں حصّہ نکال کر قربانی دینا عین اسلام کا تقاضا ہے۔

کیا رمضان جیسے ماہ مقدس نے ان مہاجرین کے متعلق آپ میں جذبۂ نو اُبھارا؟ اور آپ نے ان کے لیے رمضان میں یا عید پر، یا اب رمضان کے بعد کے دنوں میں کوئی غیر معمولی ایثار کیا ہے؟ رمضان کی برکات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جذبۂ انفاق کو بیدار اور متحرک کرتا ہے؟ تو آپ کے جذبۂ انفاق میں سے کوئی حصّہ افغان مہاجرین کو بھی ملا؟

میری دعا ہے کہ اپنے اس احتسابِ نفس کے نتیجے میں ایسے حقائق سامنے آئیں کہ جمارے قلوب مطمئن ہوں اور آخرت میں خدا کے ہاں ہمیں اس پرچے پر زیادہ سے زیادہ نمبر ملیں! آمین۔

بنی نوع انسان پر اسلام کے احسانات

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

(۲)

معاشرتی عدل

۱ــــ اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ توحید ایک خدا کو ماننے کا نام ہے۔ ایک خدا کے ماننے میں دوسرے خداؤں کا انکار مضمر ہے۔ توحید کے بعد غلامی اور عدم مساوات کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک جملہ اس سلسلے میں محفوظ کر لیا ہے۔ مصر کے گورنر اور فاتح حضرت عمروؓ بن العاص کو انہوں نے لکھا تھا:۔

متیٰ استعبدتم الناس وقد ولدتہم امہاتہم احراراً "تم نے کب سے ان لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔"

اہل یورپ آزادی کا منشور روسو کے اس جملہ کو قرار دیتے ہیں:۔

"MAN WAS BORN FREE AND HE IS EVERY WHERE IN CHAINS. THOSE WHO THINK THEMSELVES MASTERS OF OTHERS, ARE INDEED GREATER SLAVES THAN THEY."

(FROM "SOCIAL CONTRACT"—P. 49)

حالانکہ روسو (۱۷۱۲ء ــــ ۱۷۸۱ء) سے ہزار سال قبل حضرت عمرؓ (۵۸۱ ــــ ۶۴۴ء) کا قول موجود ہے۔ بہت ممکن ہے کہ روسو نے حضرت عمرؓ کے جملہ سے ہی اپنا مفہوم اخذ کیا ہو، اس لیے کہ وہ اسلام کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ بہرکیف تاریخ میں آزادی کا منشور حضرت عمرؓ کا یہ قول ہے۔

۲ــــ انسان کی غلامی انسانیت کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ ہے۔ بعثتِ نبوت کے وقت ہر جگہ غلامی کا

رواج تھا۔ یونان کے فلاسفر افلاطون اور ارسطو نے دلائل دے کر ادارۂ غلامی کو مستحکم کر دیا تھا۔ اسلام نے اس قبیح رسم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسلام کا طریقہ کار بڑا حکیمانہ تھا۔ سب سے اوّل آپؐ نے معاشرہ میں غلاموں کا درجہ بلند کیا۔ آپؐ نے فرمایا:۔ "جو تم کھاؤ وہی غلام کو کھلاؤ۔ جو تم پہنو وہی غلام کو پہناؤ۔" اس حکم نے غلامی کی قلب ماہیت (METAMORPHOSE) کر ڈالی۔ اس حکم کے بعد یہ حال ہو گیا تھا کہ آقا اور غلام میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس ایک حکم سے ساری نفرت اور حقارت جو غلاموں کے خلاف تھی وہ سب دُور ہو گئی۔ یہ قدیم الایّام سے ایک معاشرتی ادارہ (SOCIAL INSTITUTION) تھا جس سے ہزارہا نوعیت کے معاشی اور معاشرتی تعلقات اور روابط وابستہ تھے۔ اس لیے آپؐ نے قانوناً اس کا انسداد کرنے کے مقابلے میں رضاکارانہ آزاد کرنے کی ہر طرح سے ترغیب دی۔ اُمّ ولد کے قانون کے تحت ایک نسل کے بعد ہی غلام زادہ آزاد ہو جاتا تھا۔ اس طرح بتدریج غلامی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور نہ معاشی و معاشرتی بحران برپا ہوا۔ اور نہ آزاد کردہ غلاموں سے کوئی نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ معاشرہ نے ان غلاموں کو تختِ سلطنت تک پہنچا دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان (۱۲۰۶ء تا ۱۲۸۸ء) اور مصر کی تاریخ میں مملوک خاندان (۱۲۵۰ء تا ۱۵۱۷ء) دو روشن مثالیں ہیں۔

امریکہ نے بھی ۱۸۶۳ء میں غلامی کو ممنوع قرار دیا۔ ایک صدی گزر جانے کے بعد آج بھی حبشیوں کے خلاف نفرت موجود ہے۔ آج بھی اُن کو معاشرہ میں مساوی درجہ حاصل نہیں ہے اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت میں سارے سیاہ فام غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۲۔ انسانیت کی تذلیل کا ایک اور طریقہ رنگ اور نسل کی برتری کا تصوّر ہے۔ اصلاً تو یہ مرض آریہ نسل کا پھیلایا ہوا ہے۔ ہندوستان کا برہمن اور جرمنی کا نازی نسل پرستی میں سب سے پیش پیش ہے۔ اینگلوسیکسن نسل کے لوگ کسی دوسری نسل کو اپنے برابر درجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اسی لیے عظیم مؤرخ ٹائن بی کہتا ہے۔ "رنگ و نسل کی برتری کا مرض ہم نے (انگریز۔ اینگلوسیکسن نے) ساری دُنیا کو لگایا ہے۔" اسلام سے قبل عرب میں بھی نسل پرست لوگ موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے خلاف سخت جہاد کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "عربؐ کو غیر عرب پر اور غیر عرب کو عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔" قرآن کہتا ہے کہ بزرگی اور بڑائی کا تعلق تقوٰی اور پرہیزگاری سے ہے۔ یعنی اعمال سے ہے، رنگ و نسل سے نہیں۔ حضور اکرمؐ

نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں تمام نسلوں کے لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا۔ آپؐ نے ایک لشکر کا سپہ سالار ایک حبشی غلام زادہ کو مقرر کر دیا۔ ان کی ماتحتی میں ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور قریشی النسل عربوں کو دے دیا۔ اس طرح نسلی فخر و غرور کا خاتمہ کیا اور انسانی مساوات کا اصول پیش کیا۔

نماز اگرچہ ایک عبادت ہے مگر اس کے معاشرتی فوائد بھی ہیں۔ روزانہ پانچ وقت کی نماز محلہ کی مسجد میں ایک صف میں کھڑے ہو کر پڑھی جاتی ہے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز شہر کی بڑی مسجد میں یکجا پڑھی جاتی ہے۔ سال میں دو مرتبہ عیدین کی نماز سارے شہر کی یکجا پڑھی جاتی ہے۔ اور زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ سارے عالم اسلام کی نماز حج کے موقعہ پر خانہ کعبہ کے امام کے پیچھے یکجا پڑھی جاتی ہے۔ ان نمازوں میں یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس طرح ہر وقت وحدتِ اُمت کا سبق (REHEARSAL) پڑھایا جاتا ہے۔ یہ نماز میں تمیزِ رنگ و نسل کے خلاف مسلسل ابراہیم جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی طویل تاریخ میں تمیز رنگ و نسل کے فتنہ نے سر نہیں اٹھایا۔ ورنہ آج بھی متمدن دنیا اس مرض سے خالی نہیں ہے۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ کو چھوڑیے، انگلستان جیسے ملک میں ۱۹۵۵ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وزیر اعظم ایڈن (EDEN) کی بہن نے افریقہ میں ایک حبشی شاہزادے کبیاکا (KABAKA) کے ساتھ شادی کر لی تھی، اس کے خلاف اتنا ہنگامہ برپا ہوا کہ بالآخر ایڈن کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

۴ — اسلام نے مساواتِ مرد و زن کا اعلان چودہ سو سال قبل کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ ولھنّ مثل الّذی علیھنّ بالمعروف۔ (بقرہ - ۲۲۸) "عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حق ان پر ہیں"۔ اسلام سے قبل کسی مذہبی کتاب میں ایسا کوئی اعلان نہیں ہے۔ اہل یورپ نے انیسویں صدی میں مرد و زن کی مساوات کا عقیدہ قبول کیا ہے۔

۵ — نکاح کے معاملے میں عورت پر بڑا ظلم ہوتا تھا۔ مرد بہت سی عورتوں سے شادی لیتا تھا۔ اس پر کوئی بندش نہ تھی۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی مرتبہ زیادہ سے زیادہ چار عورتوں کی بندش لگائی، اور ان کے درمیان عدل کرنے کی شرط عائد کر دی۔ نکاح کو باہمی رضامندی کا ایک ——— معاہدہ قرار

دیا۔ جس کو مرد ناگزیر حالات میں طلاق کے ذریعہ اور عورت خلع کے ذریعہ فسخ کر سکتی ہے۔ نہ مسیحی دُنیا میں اور نہ ہندو دُنیا میں طرفین کو یہ حق حاصل تھا۔ اب اس صدی میں وہ اسلام کے طریقے کو قبول کر رہے ہیں

معاشی عدل

۱۔ اسلام نے صدیوں قبل سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے مفاسد سے بچ کر ایک عادلانہ رفاہی نظام جاری کیا۔

۲۔ اسلام نے سُود کو اور احتکار کو حرام قرار دے دیا، تاکہ سرمایہ داری کو فروغ حاصل نہ ہو۔

۳۔ دُنیا میں سب سے پہلے اسلام نے مال داروں کی آمدنی میں ناداروں اور محتاجوں کے لیے حق مقرر کیا۔

۴۔ زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعے چودہ سو سال قبل اجتماعی کفالت (SOCIAL SECURITY) کا نظام رائج کیا۔

۵۔ ارتکازِ دولت (سرمایہ داری) کے مقابلہ میں اسلام نے گردشِ دولت کا نظریہ پیش کیا۔

۶۔ اسلام نے صرف اکلِ حلال کی ترغیب دی اور ہر قسم کی حرام خوری اور کام چوری سے منع فرمایا۔

نظریاتی ریاست

۱۔ دُنیا میں سب سے پہلی نظریاتی ریاست اسلام نے قائم کی۔ نسلی بادشاہت، قومی اور وطنی تصوّرِ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔

۲۔ اسلام نے اپنے سیاسی اور حکومتی نظام کے لیے نئی اصطلاحات وضع کیں تاکہ سابقہ تصوّرِ ریاست سے کُلی امتیاز پیدا ہو جائے۔ اُمت وملّت (قوم)، خلافت (سلطنت و ملوکیت)، زکوٰۃ وصدقات (محصول) جہاد (حرب وقتال)، شہید (مقتول)، وفات (موت)، مالِ غنیمت (لوٹ مار)، بیت المال (خزانہ) شوریٰ (ندوہ، موتمر)، خلیفہ، امیر (ملک، سلطان) وغیرہ۔

۳۔ دُنیا میں سب سے پہلی جمہوری ریاست اسلام نے قائم کی۔ یونان کی شہری ریاستوں میں دو تہائی سے زیادہ آبادی یعنی غلام اور عورتیں ہر قسم کے حقوق سے محروم تھیں۔

۴۔ تاریخِ انسانی میں باہمی معاہدہ (SOCIAL CONTRACT) کے ذریعہ اگر کوئی ریاست قائم ہوئی ہے تو وہ مدینہ کی اسلامی ریاست ہے۔ قیامِ ریاست سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انصارِ مدینہ سے معاہدہ کیا جو بیعتِ عقبہ ثانی کے نام سے مشہور ہے۔ پھر آپ ؐ نے مدینہ جا کر یہودیوں سے باقاعدہ معاہدہ کیا۔ روسو نے معاہدہ عمرانی کا تصوّر غالباً مدینہ کی ریاست سے اخذ کیا تھا۔ ورنہ تاریخ میں اس کے علاوہ دوسری اور کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ خلیفہ کی تقرری کے بعد بیعت لینے کا طریقہ بھی

معاہدۂ عمرانی ہی کی ایک شکل تھی۔

۵ — دُنیا کی تاریخ میں پہلا تحریری دستور مدینہ میں ۶۲۲ء میں نافذ ہوا۔ جبکہ انگلستان کا دستور ۱۲۱۵ء اور چنگیز خان کا دستور ۱۲۱۸ء میں نافذ ہوا تھا۔ اس دستور میں تقریباً پچاس دفعات تھیں۔

۶ — خلافت کی بنیاد شوریٰ پر ہوتی تھی۔ خلیفہ عوام کا منتخب اور اُن کا معتمد علیہ ہوتا تھا۔ وہ عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ عوام اُس کو معزول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ شوریٰ (کابینہ) کے طریقہ پر حکومت کرنے کا آغاز سب سے پہلے اسلام نے جاری کیا۔

۷ — عوام صرف معروف میں خلیفہ کی اطاعت کے پابند تھے۔ غیر معروف اور غیر اسلامی احکام میں خلیفہ کی نافرمانی کی جاسکتی تھی۔ اس لیے کہ درحقیقت اقتدار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جس کی اطاعت ہر حال میں کرنا ضروری ہے۔

۸ — خلیفہ ایک عام شہری کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کو کوئی زائد حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ متقی اور پرہیزگار شخص ہوتا تھا۔ ملکی خزانہ پر عام آدمی سے زیادہ اس کا حق نہیں ہوتا تھا۔

۹ — اسلامی ریاست ہر طرح ایک فلاحی ریاست تھی۔ ایک خادمِ عوام ریاست تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں پہلی مرتبہ صوبوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ کانگریس کے رہنما مسٹر گاندھی نے اس موقعہ پر کانگریسی وزراء کے نام ایک پیغام جاری کیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ ہندوؤں کے رام اور کرشنا تو دیومالائی اشخاص ہیں۔ البتہ مسلمانوں کے ابوبکرؓ اور عمرؓ تاریخی شخصیتیں ہیں۔ انہوں نے بادشاہی میں فقیری کی ہے۔ میں ہدایت کرتا ہوں کہ تم اُن کی تقلید کرو۔

آزاد عدلیہ

۱ — اسلام نے قانون شریعت (RULE OF LAW) کی عملداری قائم کی۔ کوئی فرد بشر قانون سے بالاتر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خلیفہ بھی بالا نہیں تھا (KING CAN DO NO WRONG) جیسے تصورات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

۲ — عدلیہ، انتظامیہ کے ماتحت نہیں۔ وہ انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

۳ — اسلام سے قبل مقدمات فیصل کرنے کے عجیب عجیب طریقے دُنیا میں رائج تھے۔ کہیں غیب دانوں اور کاہنوں کی گواہی پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ ملزم کو صفائی کے لیے آگ میں سے گزرنا پڑتا تھا یا گرم سرخ

لوہے کا گولا ہاتھ میں اُٹھانا پڑتا تھا۔ کہیں فیصلہ کا طریقہ یہ تھا کہ فریقین ایک دوسرے پر تلوار سے حملہ آور ہوتے تھے (DUEL) جو زندہ بچ جاتا تھا وہ حق پر تصوّر کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اور یورپ میں اسی قسم کے طریقے رائج تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو غلط قرار دیا۔ مقدمات کے فیصلوں کے لیے لوگوں کی شہادت کو ضروری قرار دیا۔ آج ساری مہذب دُنیا میں یہی طریقہ رائج ہے۔

۴۔ اسلام نے سب سے پہلے قتلِ عمد اور قتلِ غیر عمد کی تفریق قائم کی۔ ورنہ نہ تو منو کے قانون میں (ہندوستان) اور نہ جسٹنین کے قانون میں (روما) یہ باریک بینی موجود تھی۔

۵۔ قاتل کو قدیم قانون میں ہر جگہ لازماً قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ اب جدید یورپ میں قتل کی سزا ہی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اسلام نے بین بین راستہ اختیار کیا ہے۔ اسلام نے خون بہا کے ذریعہ قاتل کو معاف کرنے کا طریقہ جاری کیا۔ بشرطیکہ مقتول کے ورثا راضی ہوں۔

علم کی ترغیب | دُنیا میں سب سے پہلے حصولِ علم کو اسلام نے لازمی قرار دیا۔ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ واضح رہے کہ یونان کا فلسفی ارسطو عورتوں اور غلاموں کو تعلیم دینے کا سخت مخالف تھا۔ ہندوستان کا قانون ساز منو کہتا ہے، اگر شودر کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اُس کو سزا دو اور اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دو۔

۲۔ اسلام نے حواس کی معلومات پر علمِ صحیح کی بنیاد رکھی ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (اسراء - ۳۶) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی باز پرس ہوگی۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آنکھ، کان (حواس) کے ذریعہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور پھر دل (ذہن) اس کی تصدیق کرتا ہے، اُس کو مرتب شکل دیتا ہے۔ جدید دور نے علمِ صحیح کا یہی نظریہ قبول کر رکھا ہے۔ اس علم نے علمِ نجوم، کہانت، جادو، غیب دانی کے طریقے، سفلی علوم، سب کی تہ وبالا کر دی۔ اس لیے کہ یہ علمِ صحیح سے حاصل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سرّی علوم (OCCULT SCIENCES) کبھی فروغ نہ پا سکے۔

۳۔ قرآن مجید میں مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دی۔ فرمایا قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (عنکبوت - ۲۰) ان سے کہو کہ زمین میں چلو اور دیکھو کہ اُس نے کس طرح

خلق کی ابتداء کی ہے"۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ -

(آل عمران - ۱۳۷) "تم سے پہلے بہت سے گزر چکے ہیں - زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا - جنہوں نے اللہ کی ہدایت کو جھٹلایا تھا"

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ

(حج - ۶۵) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اُس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر دیا جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اُس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے، کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی رہے"۔

یہ آیتیں تین باتوں کی تلقین کرتی ہیں :- علمِ صحیح کی تلاش، مظاہر کائنات پہ غور و خوض، تسخیر کائنات کا ارادہ - یہی تین باتیں سائنسی نقطہ نظر کی تشکیل کرتی ہیں - دنیا کو سائنسی نقطہ نظر قرآن مجید نے دیا ہے - قرآن مجید کی بتائی ہوئی روشنی پر چل کر عرب بتدریج سائنسی فکر کو پروان چڑھا رہے تھے - اس میں اندلس کے عربوں کا حصہ زیادہ تھا - مگر ابھی یہ پودا برگ و بار لانے ہی والا تھا کہ اندلس تباہ و برباد ہو گیا - پھر یورپ والوں نے اس پودے کو پروان چڑھایا - بیکن، کوپرنیکس، نیوٹن کی اصل کتابوں کا مطالعہ کیجیے - یہ سب عربوں کے احسان مند ہیں -

حقوق انسانی ۱- انسان کے بنیادی حقوق کا واضح اعلان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقعہ پر آخری خطبہ میں فرمایا - حجۃ الوداع کا خطبہ حقوق انسانی کا منشور ہے - اس سے قبل حقوق انسانی کا واضح اعلان کسی مفکر کی تعلیمات میں نہیں ملتا ہے -

۲- آج کے دور میں حقوق کی ضمانت ریاست دیتی ہے - ریاست متلون مزاج اور تغیر پذیر افراد کا ادارہ ہے - اس وجہ سے بعض اوقات افراد اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں - اس کے برخلاف اسلام ان حقوق کی پاسداری کے لیے اللہ اور رسول کی ضمانت دیتا ہے - جو شخص بھی ایمان رکھتا ہے، اس کا فریضہ ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے - اس طرح اسلامی طریقہ میں تغیر پذیر سیاسی مصلحتیں مانع نہیں بن سکتی ہیں - یہ ضمانت اقوام متحدہ کی ضمانت سے بھی زیادہ قوی ہے -

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں بلکہ دورِ زوال میں بھی جس اخلاقی بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اور جس طرح حقوق انسانی کی پاسداری کی ہے، اس کی گرد کو بھی وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو آج تہذیب و شائستگی کے

علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک روا رکھا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ قرآنی تعلیمات کی برکت تھی جس نے مسلمانوں کے اندر اتنی انسانیت پیدا کر دی کہ وہ اقتدار اور غلبہ کے دور میں بھی اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے کہ غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں نظر آتے ہیں۔

کوئی شخص آنکھیں رکھتا ہے تو خود دیکھ سکتا ہے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے تو اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا۔ اور جب عیسائیوں کو وہاں غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے کس طرح مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اور بالآخر وہاں مسلمانوں کا بیج تک نہ چھوڑا! بیت المقدس جب صلیبی سورماؤں نے فتح کیا تو کس قدر خونریزی کی اور بیت المقدس جب صلاح الدین ایوبیؒ نے فتح کیا تو کس قدر رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔ گذشتہ صدیوں میں مسلمان حکومتوں کا یہودیوں کے ساتھ کیا رویہ رہا؟ اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ اُن کا کیا رویہ ہے؟ ہندوستان کے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ اور اب آزاد ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے کس قدر مسلمانوں کی خونریزی کی ہے؟

یورپ کے مستشرقین نے اسلامی تہذیب کے ورثہ کو کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد، رازی وغیرہ مسلمان حکماء کی تعلیمات تک محدود سمجھ لیا ہے۔ اسلامی ورثہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ مہذب دنیا جن اقدارِ حیات پر ایمان رکھتی ہے، مثلاً عالمِ انسانیت کی مساوات، مساواتِ مرد و زن، مذہبی رواداری، علم صحیح کی لگن، محنت کی قدر اور جن طریقوں سے نفرت کرتی ہے۔ مثلاً:۔ نفس کُشی، غلامی، امتیازِ رنگ و نسل وغیرہ۔ اگر ان اقدارِ حیات کا شجرۂ نسب تلاش کیا جائے تو وہ عرب کے نبیٔ اُمی کی تعلیمات میں ملے گا۔ نبیٔ عربی کی تعلیمات سے قبل کہیں بھی ان اقدارِ حیات کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ درحقیقت یہ رحمتِ عالم کے فیضان کا چشمہ ہے جس سے سارا عالم مستفید ہو رہا ہے۔

سہ
آج ان ذرّوں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

امام ابن تیمیہؒ

۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ

از جناب عبد الرشید عراقی

(۲)

امام ابن تیمیہؒ کا پہلا درس

امام ابن تیمیہ کے والد ماجد عبد الحلیم ابن تیمیہ دار الحدیث السکریہ کے شیخ الحدیث تھے۔ ۳۰ ذو الحجہ ۶۸۲ھ کو اُن کا انتقال ہوا۔ اُس زمانہ میں تمام مدارس کے اندر حکومت کی طرف سے اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا۔ حافظ عبد الحلیم ابن تیمیہ کی وفات کے بعد اُن کے لڑکے تقی الدین بن تیمیہ سے بڑھ کر اُن کی جگہ کا کون اتنا لائق اور موزوں حقدار ہو سکتا تھا۔ حکومت نے فوراً امام ابن تیمیہؒ کا تقرر کر دیا۔[1] اور اُس وقت آپ کی عمر ۲۲ سال تھی۔[2]

۲ محرم الحرام ۶۸۳ھ کو امام ابن تیمیہؒ نے دار الحدیث السکریہ میں پہلا درس دیا۔ اور اس زمانے میں دستور تھا کہ نئے استاد کے پہلے درس میں قضاۃ و علماء وقت اور عمائدینِ شہر شریک ہوتے تھے۔ چونکہ امام صاحب اپنے علم و فضل کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے اُن کے پہلے درس میں لوگ بکثرت شریک ہوئے۔

جن علماء و قضاۃ نے درس میں شرکت کی، اُن کے نام یہ ہیں:۔

قاضی القضاۃ بہاء الدین یوسف بن القاضی الزکی الشافعی (م ۶۸۵ھ) شیخ الاسلام تاج الدین الفزاری الشافعی (م ۶۹۰ھ)۔ شیخ زین الدین ابو حفص عمر الشافعی (م ۶۹۱ھ) شیخ الحنابلہ شیخ

[1] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۷۲

[2] حیات ابن تیمیہ ابو زہرہ صفحہ ۶۶

زین الدین ابو البرکات المتوفی (م ۶۹۵ھ) اور بہت سے دوسرے سربر آوردہ علمائے کرام تھے۔[1]
اس درس میں تمام حاضرین بے حد متاثر ہوئے اور نوجوان عالم تبحر علمی، حاضر دماغی اور جرات وفصاحت کے معترف ہوئے[2]

حافظ ابن کثیرؒ جو شیخ الاسلام کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ اس درس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> یہ محیر العقول درس تھا۔ شیخ تاج الدین الفزاری نے اس کے کثیر فوائد اور لوگوں کی عام پسندیدگی کی وجہ سے اس کو اپنے قلم سے ضبط کیا۔ حاضرین نے ابن تیمیہؒ کی کم عمری اور جوانی کی بنا پر اس درس کی بڑی تعریف کی اور ان کو بہت داد دی۔ اس لیے کہ اُن کی عمر اس وقت ۲۲ سال کی تھی[3]

اس درس میں امام ابن تیمیہؒ نے صرف بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کے متعلق اتنے نکات بیان کیے کہ تمام سامعین حیرت میں آگئے۔ اُن کا یہ درس بیش بہا معلومات سے بھرا ہوا تھا[4]۔

قاضی بننے کی پیش کش

اُن کے علم و فضل کا شہرہ اس قدر عام ہوتا جاتا تھا کہ ۶۹۰ھ سے پہلے پہلے جب اُن کی عمر ۳۰ برس کو بھی نہ پہنچی تھی۔ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ لیکن اُنھوں نے انکار کیا۔ ۶۹۱ھ میں ابن تیمیہؒ نے حج کیا اور جب حج سے واپس آئے تو تمام ملک میں ان کے علم و فضل کا سکہ جم چکا تھا[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نصرانی کی گستاخی اور ہنگامہ

۶۹۳ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ابن تیمیہؒ کی دینی حمیت اور ایمانی جذبہ کا عملی اظہار ہوا۔ دمشق میں

---

[1] امام ابن تیمیہؒ محمد یوسف کوکن صفحہ ۴۳

[2] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۴۵

[3] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۴۶ بحوالہ البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد ۱۳ صفحہ ۳۰۳

[4] امام ابن تیمیہؒ محمد یوسف کوکن صفحہ ۴۳

[5] مقالاتِ شبلی جلد پنجم صفحہ ۶۵

عسّاف نامی ایک عیسائی کے متعلق ایک جماعت نے گواہی دی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ جب امام صاحب کو اس کا علم ہوا تو آپ دار الحدیث کے شیخ الحدیث زین الدین الفارقی کے ہمراہ نائب السلطنت عزیز الدین ایبک کے پاس گئے اور اس کو اس واقعہ کے بارے میں اطلاع دی۔ اس نے آپ کی بات کو توجہ سے سنا اور مجرم کو بلا بھیجا۔ امام صاحب اور امام زین الدین واپس جا رہے تھے اور آپ کے ساتھ ایک مجمع کثیر بھی تھا۔ راستہ میں عسّاف کو لوگوں نے آتا دیکھا اور اس کے ساتھ ایک عرب بھی تھا۔ لوگ عرب کو دیکھ کر گالیاں دینے لگے۔ عرب نے کہا۔ یہ عیسائی تم سے بہتر ہے۔ مجمع یہ سن کر مشتعل ہوگیا اور دونوں پر سنگ باری شروع کر دی، جس سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس ہنگامہ کے بعد حاکم نے امام ابن تیمیہؒ اور شیخ فارقی کو بلایا اور اپنے سامنے ان کو زدوکوب کیا۔ عیسائی مسلمان ہوگیا اور اس کی ضمانت کی حفاظت کی گئی۔ اس کے بعد امیر السلطنت نے دونوں علمائے کرام کو چھوڑ دیا اور اپنے کیے کی معافی مانگی۔[1]

اسی زمانہ میں امام صاحب نے اپنی مشہور کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول لکھی اور اس میں امام صاحب نے اس مسئلے پر چار پہلوؤں پر بحث کی۔

۱ــ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دینا چاہیے۔

۲ــ یہ کہ اس کا قتل واجب ہے۔ چاہے وہ ذمی ہی کیوں نہ ہو۔ زرفدیہ لے کر یا اس کے ساتھ احسان کر کے اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

۳ــ یہ کہ گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دینا چاہیے۔ اس سے توبہ نہیں کرانی چاہیے۔ اگر یہ معاملہ سلطان تک پہنچ جائے اور اس پر الزام کا ثبوت ہو جائے تو توبہ کرنے پر بھی اس کی حد ساقط نہیں ہوگی۔

۴ــ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا کافر ہے۔ چاہے وہ اس کو حلال سمجھے یا حلال نہ سمجھے۔[2]

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۴۶ بحوالہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۳ صفحہ ۳۳۵-۳۳۶۔
[2] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۸۰

امام ابن تیمیہ کی پہلی مخالفت

امام ابن تیمیہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ اور عوام و خواص میں اُن کی مقبولیت و شہرت روز افزوں تھی۔ ۶۹۸ھ میں اُن کے خلاف پہلی بار شورش برپا ہوئی اور اُن کی ذات اور اُن کے عقائد موضوع بحث بنے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ ۶۹۸ھ میں شہر حماۃ (شام) کے چند باشندوں نے ایک استفسار بھیجا جس میں دریافت کیا گیا کہ الرحمن علی العرش استوٰی — ثم استوٰی الی السماء جیسی آیات اور ان قلوب بنی آدم بین اصبعین من اصابع الرحمن اور یضع الجبار قدمہ فی النار کے بارے میں علماء کی کیا تحقیق ہے۔ اور صفات کے بارے میں علمائے اہلِ سنت کا مسلک کیا ہے۔

شیخ الاسلام نے اس کا بسوط جواب "العقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ" کے نام سے لکھا۔ اس میں وضاحت کے ساتھ صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین کرام، ائمہ مجتہدین، متکلمین اور متقدمین کا مسلک بیان کیا۔ اور نہایت شرح و تفصیل سے سلف کے عقیدہ پر روشنی ڈالی۔ مگر اشاعرہ اور متکلمین میں جن کو جمہور اور حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اور جو قضاء و افتاء کے سرکاری منصبوں سے لے کر درس و تصنیف کے علمی حلقوں تک حاوی تھے، ناراضگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسا کہ علامہ ابن کثیرؒ اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> علماء کا ایک گروہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ حنفی قاضی شیخ جلال الدین کی مجلس میں حاضر ہوں۔ اور اس فتویٰ کے متعلق صفائی پیش کریں۔ ابن تیمیہ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ اس پر شہر میں منادی کرا دی گئی کہ یہ فتویٰ قابلِ قبول نہیں۔ لیکن امیر سیف الدین جاغان نے ابن تیمیہ کی حمایت کی اور اُن لوگوں کو طلب کیا جنہوں نے ہنگامہ کیا تھا۔ مگر اُن میں سے اکثر روپوش ہو گئے۔ امیر نے منادی کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو زدوکوب کیا۔ جس سے باقی خاموش ہو گئے۔ جب جمعہ کا دن تھا تو شیخ اپنی عادت کے مطابق جامع مسجد میں گئے اور اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی تفسیر بیان کی۔ اگلے روز ہفتہ کو وہ قاضی امام الدین (الشافعی) کے پاس گئے۔ اور فضلاء کی ایک جماعت بھی وہاں آگئی۔ ان سب نے فتوائے حمویہ کے بارے میں سوال و جواب کیا،

اور کئی مقامات کی توضیح چاہی۔ اُنہوں نے سب کو مطمئن اور خاموش کر دیا۔ شیخ واپس آگئے اور حالات اعتدال پر آگئے۔

تاتاریوں کے خلاف جہاد امام صاحب سکون کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، اور تحقیق و تدقیق کے جوہر دکھا رہے تھے کہ ۶۹۹ھ میں تاتاریوں نے شام پر دھاوا بول دیا۔ اور ناصر الدین قلاؤن والیٔ مصر کے لشکر کو شکست دے دی۔ جس سے سب حواس باختہ ہو گئے۔ مصر و شام کے لشکر نے ہزیمت کھائی اور تاتاریوں نے دمشق کی طرف رُخ کیا۔ یہاں کے لوگ بھی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔[1]

پروفیسر ابوزہرہ مصری اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

اس حملہ کے خوف سے علماء و اکابر نے بھی فرار کی راہ اختیار کی۔ اعیان و امراء کو بھی بھاگتے بنی۔ حد یہ ہے کہ قاضی شافعیہ امام الدین اور قاضی مالکیہ زواوی اور دوسرے کبار علماء اور کبار رجال کے قدم نہ ٹک سکے۔ حالت یہ ہو گئی کہ شہر تمام بڑے آدمیوں سے خالی ہو گیا۔ نہ کوئی حاکم تھا کہ نظم و انتظام اور امن وامان بحال رکھتا، نہ کوئی عالم تھا کہ وعظ و تذکیر اور پند و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھتا جس سے حوصلے بلند ہوتے اور عزائم قائم رہتے۔

لیکن ایک عالم تھا جو بے نوا اور بے سہارا عوام کے درمیان استقلال و عزیمت کی پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ نہ یہ بھاگا۔ نہ اس کے قدم اُکھڑے۔ اُس کا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کہ عامہ مسلمین کو آشفتہ حال اور پریشان چھوڑ کر اپنی عافیت اور اطمینان کا سہارا پیدا کرے۔ اس مصیبت کے وقت اُس نے گوارا نہیں کیا کہ مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جائے۔ اُس کا دینی احساس اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ عوام کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلتا بنے کہ ہر طرف انارکی پھیلی ہو، نہ کوئی حاکم ہو، نہ کوئی نظام۔[2]

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۵۰ بحوالہ البدایۃ والنہایہ جلد صفحہ ۴۰

[2] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۸۷ - ۸۸

دمشق میں کوئی حاکم موجود نہ تھا۔ ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ گرانی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک سو قیدی جیل کا دروازہ توڑ کر باہر نکل آئے۔ اور لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ پورے دمشق میں طوفانِ بدتمیزی برپا تھا۔ اُدھر قازان کی آمد کا غلغلہ تھا۔ جس سے رہے سہے حواس اور پراگندہ تھے[1]

امام ابن تیمیہؒ کی شاہ قازان سے ملاقات

امام ابن تیمیہ ایک وفد کی صورت میں شاہ قازان سے ملاقات کے لیے اس کے لشکر میں پہنچے۔ اور شاہ قازان سے ملاقات کی۔ وفد کے ایک ممبر کمال الدین الانجار اس ملاقات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں:۔

میں شیخ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ سلطان قازان کو عدل وانصاف کی آیات واحادیث اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات واحکام سُناتے تھے۔ اُن کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ قریب تھا کہ اُن کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہیں ہوئی۔ وہ بڑی توجہ سے کان لگائے اُن کی گفتگو سُن رہا تھا۔ اور ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس پہ اُن کا رعب ایسا طاری تھا۔ اور وہ ان سے ایسا متاثر تھا کہ اُس نے اُن لوگوں سے پوچھا کہ یہ عالم کون ہیں۔ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ اُس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا۔ مجھ پہ ابھی تک ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔ لوگوں نے ان کا تعارف کرایا اور اُن کے علمی اور عملی کمالات کا تذکرہ کیا۔

ابن تیمیہؒ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی امام، شیخ اور مؤذنین بھی رہا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا۔ حالانکہ تمہارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز رہے۔ اُنہوں نے جو کچھ عہد کیا تھا وہ پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا

[1] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۵۳ - بحوالہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ صفحہ ۷

وہ توڑ دیا۔ اور جو کچھ کہا تھا، اُس کو پورا نہیں کیا۔ اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا۔[۱]

امام صاحب نے یہ تقریر کی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جس طرح عزت اور سربلندی کے ساتھ دربار سلطانی میں تشریف لے گئے تھے اُسی اِجلال و اکرام کے ساتھ علم کدہ میں واپس تشریف لے گئے۔[۲]

صاحب الکواکب الدریہ الشیخ مرعی بن یوسف الکرمی الحنبلی لکھتے ہیں کہ وفد کے ایک دوسرے رکن قاضی القضاۃ ابوالعباس فرماتے ہیں۔

"سلطان قازان کے دربار میں امام صاحب جلوہ افروز ہوئے تو دستر خوان چنا گیا۔ وفد کے ممبروں اور دوسرے لوگوں نے کھانا کھایا۔ لیکن امام ابن تیمیہ نے ہاتھ روک لیا۔ پوچھا گیا۔

آپ کیوں نہیں تناول فرماتے۔

ارشاد فرمایا:

اے سلطان! میں تیرا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں۔ یہ کھانا وہی تو ہے، جو لوگوں کو لوٹ کر تیار کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ پکا ہوا سامنے موجود ہے۔ یہ انہی ٹہنیوں پر لپکایا گیا ہے، جو ازراہ ظلم و جور کاٹے ہیں۔ قازان نے سر جھکا لیا۔ پھر امام صاحب سے دُعا کی استدعا کی۔ امام صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ اور فرمایا: اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ قازان نے تلوار اس لیے میان سے نکالی ہے کہ تیرا کلمہ بلند ہو اور تیرے راستہ میں جہاد کرے، تو پھر اُس کی مدد کیجیو۔ اسے اپنی نصرت سے نوازیو۔ لیکن اگر یہ جنگ زرگری میں مبتلا ہے۔ دُنیا اور بادشاہت اور توسیع مملکت کے لیے برسرِپیکار ہے تو پھر تو اس سے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیو —— حالت یہ تھی، کہ امام صاحب یہ دُعا کر رہے تھے۔ اور قازان کے منہ سے بے ساختہ آمین آمین نکل رہا تھا۔

[۱] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۴۵ بحوالہ الکواکب الدریہ صفحہ ۱۶۲

[۲] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۷۹۔

اور ہم اس خوف سے دامن سمیٹے بیٹھے تھے کہ امام صاحب کی گردن ضرور اڑا دی جائیگی اور خون کے چھینٹے ہمارے لباس پر پڑیں گے۔ پھر جب ہم دربارِ سلطانی سے اٹھ کر باہر آئے تو ہم نے امام صاحب سے کہا۔

آپ نے تو آج ہم سب کی جان لے لی تھی اور ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔

امام صاحب نے فرمایا؛

میں خود آپ حضرات کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوں۔ جائیے تشریف لے جائیے،

چنانچہ ہم لوگ چل کھڑے ہوئے اور امام صاحب پیچھے رہ گئے۔

امام صاحب کے اس کارنامہ کا حال سن کر شہر کی عورتیں اور مرد، غریب و امیر سب استقبال اور حصولِ دیدار کے لیے آن موجود ہوتے۔ چنانچہ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو تین سو عقیدت مندوں اور ثنا خوانوں کا مجمع ہم رکاب تھا۔

اور ہماری یہ گت بنی کہ جب ہم امام صاحب سے جدا ہو کر آگے بڑھے، تو غارت گروں کی ایک جماعت نے ہم پر چھاپا مارا۔ اور ہمارے کپڑے تک اتروا لیے۔[1]

اس کے بعد اگرچہ تاتاریوں کی طرف سے اہلِ دمشق کو پروانہ امن مل گیا تھا، لیکن شہر میں مکمل طور پر امن و سکون نہیں ہو سکا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ گمراہی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے شریف خاندانوں اور علماء کے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں غلام اور باندیاں بنالی گئیں۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت امام نے دوبارہ قازان سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ لیکن سلطان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اس کے بعد اگرچہ قازان چلا گیا۔ اور جاتے ہوتے یہ کہہ گیا کہ اگلے سال پھر موسم خزاں میں ہم دوبارہ آئیں گے اور شام کے ساتھ مصر بھی فتح کریں گے۔[2]

تاتاریوں کی دوبارہ آمد اور اعلان جہاد
اور حضرت امام کا شاہ مصر کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق

سنہ شروع ہی ہوا تھا کہ تاتاریوں کی دوبارہ آمد کی اطلاع دمشق میں پہنچی۔ لوگوں کے حواس جاتے رہے۔

---

[1] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۸۰ — ۸۱

[2] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۵۷

دہشت اور سراسیمگی کا دور شروع ہوگیا۔ نہ کوئی حاکم تھا، نہ کوئی محکوم، نہ کوئی آئین تھا، نہ قانون۔ امام صاحب کی غیرت ملی پھر جوش میں آئی۔ وہ مدرسہ سے نکلے، میدان میں آئے اور سپاہِ شام کو قتال و جہاد پر اُکسایا۔ اُن سے نصرت کا وعدہ کیا۔ ظفر کی بشارت دی اور کلام پاک کی اس آیت مبارکہ

اور جس نے اُسی قدر بدلہ لیا جس قدر اُسے تکلیف دی گئی تھی۔ پھر اُس پر زیادتی کی گئی، تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا بے شک اللہ درگذر کرنے والا معاف کرنے والا ہے۔ (الحج ــ ۶۰)

کی تفسیر کرتے ہوئے ایسی دلنشین تقریر کی کہ لوگوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔

اس کے بعد امرائے دمشق نے امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ مصر تشریف لے جائیں اور شاہِ مصر کو اس پر آمادہ کریں۔ چنانچہ شیخ الاسلام مصر پہنچے تو شاہِ مصر کو غیرت دلائی۔ چنانچہ امام صاحب کی ایمان افروز تقریر سے سلطان شام کی مدد کے لیے آمادہ ہوگیا [۱]

امام صاحب کے دمشق سے چلے جانے کے بعد وہاں کے حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے تھے اور تاتاریوں کی آمد قریب تھی۔ اور دوسری طرف سلطان کی واپسی کی خبر بھی پھیل گئی۔ جس سے شہر میں بہت افراتفری پھیل گئی اور دوسرا واقعہ یہ رونما ہوا کہ دمشق کے حاکم نے اعلان کر دیا کہ جو شخص دمشق سے جانا چاہتا ہے وہ چلا جائے۔ اُس پر کسی قسم کی گرفت نہیں۔ اس اعلان سے لوگ اور بھی سراسیمہ ہوگئے۔ اور شہر سے نکلنا شروع کر دیا۔ اُدھر امام صاحب مصر سے دمشق واپس پہنچ گئے تو لوگوں کو کچھ حوصلہ ہوا۔ امام صاحب نے مصری افواج کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ چنانچہ لوگ مصری افواج کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ابھی مصر کا لشکر نہیں پہنچا تھا کہ معلوم ہوا کہ تاتاری شام پر حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے کم از کم اس سال کے لیے تو چلے گئے [۲]

---

[۱] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۸۴ بحوالہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ صفحہ ۱۵
[۲] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۸۵

شرک و بدعت کے ازالہ کے لیے امام ابن تیمیہؒ کی مساعی

امام ابن تیمیہ ایک پُرجوش عالم تھے۔ وہ ابتداء ہی سے کتاب وسنّت کی روشن تعلیمات کی اشاعت میں اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا کرتے تھے۔ اُن کی نظر کے سامنے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد مبارک تھا۔

من رأى منكم منكراً فليغيّره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه ذلك اضعف الايمان (الحديث)

تم میں سے جو کوئی بُرائی دیکھے تو چاہیے کہ اُس اپنے ہاتھ سے بدل دے مگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے کام لے۔ پھر اگر اتنی بھی استطاعت نہ ہو تو اُس کو اپنے دل میں بُرا سمجھے۔ یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

امام صاحب نے تاتاریوں سے فرصت پاکر حسبِ معمول پوری سرگرمی کے ساتھ درس وتدریس اشاعتِ سنّت اور ردّ بدعت کا کام شروع کر دیا۔ اور شرک وجاہلیت کے خلاف جہاد میں مشغول ہوگئے۔ امام صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ شرک و بدعت کا قلع قمع کیا جائے۔ اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط اور فاسد العقیدہ اور جاہل مقتداؤں کی تعلیم سے بہت سے ایسے اعمال آگئے تھے جو جاہلیت کی یادگار اور مشرک وبُت پرست اقوام کا شعار تھے۔ امام صاحب نے ان سب منکرات کی تردید میں پہلے یہ کام کیا کہ کتاب وسنّت اور فقہ اسلامی کے دلائل وبراہین کے ساتھ اُن کا مدلّل اور مفصّل جواب لکھا۔ اس سے عوام پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اور عوام کو معلوم ہوا کہ عام مسائلِ زندگی میں کتاب وسنّت کے ارشادات سے کس طرح استدلال و استنباط کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا آپ نے عملی کام یہ کیا کہ نہر قلوط کے کنارے ایک چٹان تھی جس کی زیارت کو مسلمان جاتے تھے اور وہاں جاکر نذر نیاز دیتے تھے۔ امام صاحب رجب ۷۰۴ھ میں مزدوروں اور سنگ تراشوں کے ساتھ وہاں خود گئے۔ اور اس کو کاٹ کر بالکل نیست ونابود کر دیا۔[۱]

(باقی)

---

[۱] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۹۶ - امام ابن تیمیہؒ محمد یوسف کوکن صفحہ ۱۳۶ - تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۴۶ - بحوالہ البدایہ والنہایۃ جلد ۱۴ صفحہ ۳۴

ترکی میں اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش

(حالیہ انقلاب سے پہلے تک)

جناب خلیل احمد حامدی

ترکی کی اسلامی تحریک کے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے خود ترکی کے بارے میں چند بنیادی حقائق جان لینا مفید رہے گا۔

تاریخی پس منظر ترکی کا موجودہ رقبہ ۷ لاکھ ۸۰ ہزار ۵ سو ۷۶ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۴۳ ملین یعنی ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد۔ اس میں ۹۸٫۹ فیصد مسلمان ہیں اور ۱٫۱ فیصد دیگر اقلیتیں مثلاً یہودی، آرتھوڈکس، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ کے پیروکار۔

ترکی کے موجودہ علاقے کو ماضی میں ایشیائے کوچک کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ حصّے مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے ملاذکرد میں بازنطینی حکمران کو شکست دے کر اس علاقے میں مسلمانوں کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی مکمل سلطنت اس علاقے میں ۱۲۸۸ء میں قائم ہوئی جس کا بانی عثمان بن ارطغرل تھا۔ اس لیے تاریخ میں اُسے سلطنت عثمانیہ کہا جاتا ہے۔ عثمانی حکمرانوں کی شجاعت اور دینی حمیت کی بدولت یہ سلطنت مسلسل ترقی پذیر رہی۔ ۱۵۲۰ء سے لے کر ۱۵۶۶ء تک کا زمانہ اس سلطنت کا دورِ عروج کہلاتا ہے۔ یہ سلطان سلیمان قانونی کا دورِ حکومت تھا۔ اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ روس کے جنوب، ایشیائے کوچک، عراق اور خلیجِ عربی سے لے کر شمالی افریقہ میں مراکش کی حدوں تک پھیل گئی۔ عثمانیوں نے دو مرتبہ (۱۵۲۹ء اور ۱۶۸۳ء میں) یورپ کے اندر ویانا کے راستے پیش قدمی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتے رہے۔ اگر عثمانی سلاطین یورپ میں

داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو اب دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

ایک طرف یورپ کی صلیبی طاقتوں کے سامنے سلطنتِ عثمانیہ برسرِ پیکار رہی۔ اور دوسری طرف ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں پوری دو صدیوں میں روس کے ساتھ ترکی کی طویل جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ دونوں طاقتیں سلطنتِ عثمانیہ کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی رہیں۔ آخر کار یہ سلطنت ۱۹ ویں صدی کے وسط سے کمزور ہونا شروع ہوئی۔ بیرونی دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ اب اندرونی طور پر بھی ایسے اسباب مہیا ہو گئے جنہوں نے سلطنت کی جڑیں ہلا دیں۔ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں بیرونی اور اندرونی دونوں طرح کے دشمنانِ اسلام کو مصطفےٰ کمال پاشا کی شکل میں ایک ایسا شخص مل گیا، جس نے اُن کی آرزوؤں کو پورا کر دیا۔ کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں عثمانی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد ترکی نہایت تاریک دور میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کی وفات تک پورے ۱۴ سال ترکی لادین آمریت کے شکنجے میں گرفتار رہا۔ کمال اتاترک کے مرنے کے بعد عصمت انونو حکمرانی کی مسند پر بیٹھا اور ۱۹۵۰ء تک اس نے فوجی حربوں کی مدد سے حکومت کی اور اس پالیسی کو پوری طاقت کے ساتھ برقرار رکھا جو اس کے پیش رو نے تجویز کی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں عصمت انونو کے ہاتھ سے اقتدار نکل گیا۔ اور پھر اسی وقت سے ترکی میں واحد حکمران پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹیاں بھی وجود میں آگئیں۔ اور ترکی سیاست میں ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہو گیا۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی "اصلاحات"

مصطفےٰ کمال پاشا اور اُس کے ساتھیوں نے ترکی کے اندر اسلامی خلافت کو ختم کرنے کے بعد جو کچھ وہاں کیا وہ ایک طویل بحث ہے۔ اس کا خلاصہ میں استنبول کے ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں فقہ کے پروفیسر خیرالدین قرہ مان کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

> "ترکی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ دیا گیا۔ اُسے مادہ پرست، قوم پرست اور مغربی تہذیب کی دلدادہ قوم بنانے کی کوشش کی گئی۔ ترکی کو ایک لادین ریاست میں بدل دیا گیا۔ مذہب اور سیاست کو جدا جدا کر دیا گیا۔ مذہب کو انسان کا ذاتی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور ہر فرد کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ خلافت کا ادارہ منسوخ کر دیا گیا، شرعی قوانین اور اسلامی عدالتیں ختم کر دی گئیں۔

شرعی قوانین کے بجائے یورپی قوانین درآمد کیے گئے۔ سوئٹزرلینڈ سے دیوانی قانون، اٹلی سے فوجداری قوانین اور جرمنی سے تجارتی قانون درآمد کیا گیا۔ احوالِ شخصیہ یعنی نکاح و طلاق اور وراثت و وصیت کے معاملات یورپ کے دیوانی قانون کے تابع کر دیے گئے۔ دینی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی اور دینی تعلیم کے ادارے مقفل کر دیے گئے۔ عورت کے لیے پردہ ممنوع اور بے پردگی لازم قرار دی گئی۔ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا نظام جاری کیا گیا۔ عربی رسم الخط منسوخ کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ عربی زبان میں اذان روک دی گئی۔ لباس بدل دیا گیا۔ پتلون اور ہیٹ کا استعمال لازم ٹھہرا لیا گیا۔"

(بحوالہ ہفت روزہ الدعوۃ۔ ریاض شمارہ ۲/ فروری ۱۹۸۱ء)

نوری تحریک اس دورِ ظلمت میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی خدا کے بندے اٹھے اور جان کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ ان میں نمایاں ترشخصیت علامہ بدیع الزمان سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ موصوف ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں فوت ہوئے۔ گویا انہوں نے ترکی کا پورا دورِ زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خلافت اُن کے سامنے ختم ہوئی۔ علمائے حق ان کی آنکھوں کے سامنے جامِ شہادت نوش کرتے رہے یا تعذیب کی بھٹی میں جھونکے جاتے رہے۔ لادینیت کا دیو استبداد اُن کے سامنے پاکوبی کرتا رہا۔ اس دورِ پُرآشوب میں انہوں نے اسلام کی دعوت کا فریضہ سنبھالا۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی فکری یلغار کے سامنے اسلام کے بنیادی عقائد کی اشاعت پر زور دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مضامین قلمبند کرتے اور پھر اپنے شاگردوں کے ذریعے ان کی دستی کاپیاں تیار کروا کر عام لوگوں کے اندر خفیہ طور سے پھیلاتے۔ یہ سلسلہ انہوں نے اس منظم اور خاموش طریقے سے جاری کیا کہ پیشتر اس کے کہ ترکی کے لادین حکمرانوں کو اس کی خبر ہو، اُن کی دعوت ہزاروں نوجوانوں تک پہنچ گئی۔ ان مضامین کو "رسائلِ نور" کا عنوان دیا گیا۔ ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ اور یہ دست بدست ملک کے اندر پھیل رہے تھے۔

جب حکومت کو ان رسائل کا علم ہوا تو وہ بڑی بجز بجز ہوئی۔ چنانچہ علامہ بدیع الزمان نورسی اور اُن کے شاگردوں کے خلاف حکومت حرکت میں آگئی۔ اور شدت کے ساتھ اُن کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علامہ مرحوم کی زیادہ تر زندگی جیل کی سلاخوں کے اندر گذری۔ بارہا اُن پر مقدمات

قائم کیے اور اُن پر الزام صرف یہ تھا کہ وہ ایک لادین ریاست کے اندر اسلام کا پرچار کرتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں مُلک میں امنِ عامہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک مرتبہ مرحوم نے ترکی عدالت کے سامنے اپنا دفاع کرتے ہوئے فرمایا:

"کوئی بھی تحریک خواہ وہ کتنی ہی پھیل جائے حکومت کے سقوط تک نہیں پہنچ سکتی۔ ماچس کی ایک تیلی سے اگرچہ ایک عمارت نذرِ آتش کی جا سکتی ہے۔ لیکن کیا یہ معقول بات ہوگی کہ جس کے پاس بھی وہ تیلی ہو، وہ مجرم ہے خواہ وہ عمارت کو جلانے کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ۔ وکیل استغاثہ نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ رسائلِ نور اس حد تک پھیل چکے ہیں کہ کم از کم اناضول کے اندر ۶ لاکھ انسان انہیں پڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے اساتذہ بھی ہیں اور کسان بھی۔ طلباء بھی ہیں اور سرکاری ملازمین بھی۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان رسائل کے مطالعہ کے بعد کسی شخص نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی کی ہے؟ یا اُس کی قومی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے؟ یا اُن میں سے کسی شخص کے ہاتھوں امنِ عامہ کو خطرہ لاحق ہوا ہے؟ یا اُس نے مُلکی دستور کی خلاف ورزی کی ہے؟ لہٰذا تم اس تعلیمی مشن کو بند کرنے کے لیے کیا جواز رکھتے ہو، جس کی جڑیں لاکھوں ترک شہریوں کے دل میں اُتر چکی ہیں؟"

"تمہارا یہ اعتراض بھی ہے کہ ہماری یہ سرگرمیاں حکومت کی اجازت کے بغیر جاری ہیں۔ یعنی ہمارا فرض تھا کہ ہم حکومت کے محکمہ اُمورِ مذہبی سے لائسنس لے کر یہ کام کرتے۔ یعنی ہم اللہ کی عبادت اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کے لیے حکومت سے لائسنس لیتے؟ مجھ پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ سرکاری احکام کے باوجود میں نے ترکی ٹوپی ترک کر کے ہیٹ نہیں پہنا۔ اور اسی حالت میں عدالت میں آ گیا ہوں، اس سے عدالت کی توہین ہوتی ہے۔ لیکن آپ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مُلک کے اندر ان لوگوں کی تعداد انتہائی کم ہے جنہوں نے خوشدلی کے ساتھ عمامہ چھوڑ کر یورپی ہیٹ اوڑھا ہے آپ لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ تو یہ ناروا سلوک ہے اور دوسری طرف فری میسن اور دوسرے اُن کے ہم مشرب لوگوں کو اس امر کی کھُلی چھُٹی ملی ہوئی ہے کہ وہ اسلام کا

جس قدر شرمناک طریقے سے تمسخر اُڑانا چاہیں اُڑا لیں ۔ اور جس حد تک چاہیں لوگوں کے اندر شراب، زنا اور جوئے کو رواج دیں اور مجھے اتنی بھی اجازت نہ ہو کہ میں لوگوں کو قرآن سناؤں اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دوں"۔

مرحوم کو عمر کے آخری حصے میں ایک بار پھر گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی اُن پر الزام یہ عاید کیا گیا تھا کہ وہ امن شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اقتدار کے بھوکے ہیں۔ مرحوم نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

" اے حکمرانو، تم سمجھتے ہو کہ میں کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ تمام جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں ۔ دیکھو اسی سال کا بوڑھا انسان، جس کی ٹانگیں قبر میں ہیں ۔ بے وسیلہ انسان جس کے پاس دنیا کی کوئی متاع نہیں ہے۔ نہ مکان اور نہ زمین ۔ اس عمر میں میں کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کر کے کیا کروں گا ۔ میں نے اپنی زندگی میدانِ جہاد میں گزاری ہے ۔ جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں مجھے برسوں تک محبوس رکھا گیا، کبھی جیل میں اور کبھی جلاوطنی میں بے بس و بے سہارا پڑا رہا ۔ بستی بستی اور شہر شہر میرا تعاقب کیا گیا۔ معاشرے کے اندر تم لوگوں نے مجھے اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ تم لوگوں نے مجھے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے سے بھی محروم رکھا۔ اگر میرے اندر ایمان و احتساب کی طاقت نہ ہوتی جو ہمیشہ مجھے مایوسی کی تاریکیوں سے نکالتی رہی ہے تو میں اس مکدر زندگی پر موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن ان آلام و مصائب سے پُر زندگی کے باوجود میں نے یہ رسائل تحریر کیے ہیں اور الحمدللہ ان رسائل سے ۵ لاکھ سے زیادہ انسانوں نے استفادہ کیا ہے ۔ میں اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنی قوم کی خاطر یہ قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائی"۔

جماعتِ نور اور دوسرے چند اسلامی گروپ سیاست سے کنارہ کش ہو کر جوانوں کی فکری اور اخلاقی تربیت میں لگے رہے ۔ سیاست سے ان کی کنارہ کشی اسلام کے جامع تصور سے ناواقفیت کی بنا پر نہ تھی ۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ اُن کا سامنا ایک نہایت بے رحم اور ظالم و جابر حکومت سے تھا، جس نے ملک کے اندر الحاد اور بے دینی کو فروغ دینے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار

کر رکھے تھے۔ اور ترک نوجوان ان سے متاثر اور مرعوب ہو رہے تھے، اسی لیے بدیع الزمان نورسی مرحوم اور ان کے شاگرد تعلیم و تربیت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ خود بدیع الزمان نورسی مرحوم کا ابتدائی دور سیاسی سرگرمیوں سے بھرپور نظر آتا ہے۔ وہ اقتدار کے خلاف بڑی جرأت کے ساتھ برسرپیکار رہے ہیں اور بڑے بڑے سیاسی معرکے انہوں نے سرانجام دیے ہیں۔ کئی مرتبہ انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ بلکہ اُن کے بیسیوں ساتھیوں کو بالفعل تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وہ عزیمت کا پہاڑ تھے۔ لیکن آخرکار انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ حالات کے پیش نظر اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے اندر ایمان و عقیدے کی پختگی کے ساتھ اُن کی اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ جب حالات میں کچھ تبدیلی ہو تو پھر یہی نوجوان اسلام کے کامل احیاء کا علم تھام لیں۔ علامہ بدیع الزمان نورسی کی دُور اندیشی کام آگئی۔ ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک اسی نرسری فارم سے تیار ہوئی ہے جس کی تخم ریزی اور آبیاری مرحوم کر گئے ہیں۔

جمہوری زندگی کا آغاز

یہ تھا ترکی کی اسلامی تحریک کا ایک دَور۔ دوسرا دَور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنی بات کو ۱۹۵۰ء سے شروع کرنے کے بجائے اس دَور کے عالمی حالات پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان عالمی حالات نے ہی درحقیقت ترکی کی اسلامی تحریک کو ایک نئے دَور میں داخل کیا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سٹالن نے ترکی کے سامنے چند نئے مطالبات رکھے۔ مثلاً رُوس کو آبنائے باسفورس استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ ترکی کے بعض صوبوں پر بھی سٹالن نے دعویٰ کر دیا۔ ترکی کی کمزور حکومت ان روسی مطالبات سے پریشان ہو گئی۔ اور اُسے امریکی سیاست کے سامنے جھک کر اپنے بچاؤ کے لیے معاہدۂ اطلانتک میں شامل ہونا پڑا۔ لیکن معاہدہ اطلانتک کے رُکن ممالک نے اس وقت تک ترکی کی رُکنیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک ترکی کے اندر جمہوری نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ یعنی یک جماعتی آمرانہ نظام کے بجائے ایک سے زیادہ جماعتوں کا نظام۔

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ معاہدۂ اطلانتک کے رُکن ممالک کا مقصد یہ تھا کہ انہیں یہ اطمینان ہو جائے کہ ترکی کا سیکولر نظام فی الواقع عوام کے جذبات کا آئینہ ہے۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ ترکی

میں مغربی طرز کے جمہوری نظام کی بدولت ترکی کو مکمل طور پر سیکولر بنا دیں گے، اور ترکی صحیح معنوں میں یورپ کا ایک حصہ بن جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شر میں سے ترک مسلمانوں کے لیے خیر کا پہلو برآمد کر دیا۔

ترکی نے یہ مطالبہ مان لیا کہ وہ وہاں ایک مغربی نظام کے بجائے تعددِ احزاب کا نظام جاری ہو۔ ترکی کی حکمران جماعت ریپبلکن پارٹی کے صدر عصمت انونو صاحب کو یہ نیا نظام قبول کر لینے پر اس لیے کوئی تشویش نہ ہوئی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں لادینیت کی جڑیں خاصی مضبوط ہو چکی ہیں۔ اسلام کے بارے میں نفرت لوگوں کے دلوں میں رچ بس چکی ہے۔ اور مغربی طرزِ زندگی پر لوگ اس قدر فریفتہ ہو چکے ہیں کہ اب ان کے لیے اسلام کی طرف واپس آنا ناممکن ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی میں جو اپوزیشن پارٹی بھی وجود میں آئے گی وہ ریپبلکن پارٹی کے بطن سے جنم لے گی اور یوں وہ ان تمام اوصاف کی حامل ہوگی جو خود ریپبلکن پارٹی کے اندر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ عصمت انونو نے کمال اتاترک ہی کے دور کے ایک وزیر بایار کو یہ مہم سپرد کی کہ وہ حزبِ مخالف تشکیل کریں۔ چنانچہ حکمران پارٹی ری پبلکن کے مقابلے میں جلال بایار نے ڈیموکریٹک پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی میں جلال بایار کے بعد دوسری شخصیت عدنان مندریس کی تھی۔

اسلامی اصلاحات عدنان مندریس کے عہد میں

عدنان مندریس کا تعلق ترکی کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے والد عالمِ دین تھے۔ خود عدنان مندریس عوام الناس کی نفسیات اور اُن کے احساسات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ وہ انھیں خطاب کرنا جانتے تھے۔ والد کی رُوح بھی ان کے اندر سرایت کیے ہوئے تھی۔ آگے چل کر وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے ایک دھماکہ خیز شخصیت ثابت ہوئے۔

نئے نظام کے تحت ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ ترکی میں انتخابات ہوئے۔ ڈیموکریٹک پارٹی ایک حیرت انگیز منشور لے کر انتخابات میں اُتر گئی۔ امریکی مبصرین کے مطابق بظاہر حالات میں اس منشور کی ناکامی یقینی امر تھا۔ وہ منشور یہ تھا:-

۱— ترکی کے اندر عربی زبان میں اذان بحال کر دی جائے گی۔

۲— ترکوں کو حج بیت اللہ کی اجازت دے دی جائے گی۔

۳ ـــ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس پر پابندی ختم کر دی جائے گی۔
۴ ـــ ریاست عورت کے لباس کے معاملے میں کوئی دخل نہ دے گی۔
۵ ـــ ایا صوفیا کی مسجد واگزار کر دی جائے گی۔ (یہ مسجد پانچ سو سال سے چلی آرہی تھی، جسے کمال پاشا نے میوزیم میں بدل دیا تھا)۔

ایک ترک دانشور نے اس منشور پر اور دو پارٹیوں کو انتخابات میں شریک ہونے کی اجازت دیے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے؟

"امریکی لیڈر دراصل یہ امتحان لینا چاہتے تھے کہ کمال ازم ترکی کے اسلامی جذبات کی بیخ کنی میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے لیکن اس امتحان کا نتیجہ ان کے لیے انتہائی حیران کن نکلا۔ کمال پاشا کی ری پبلکن پارٹی پہلے ہی مرحلے میں گر گئی۔ اسے پارلیمنٹ میں صرف ۳۲ نشستیں ملیں جب کہ ڈیموکریٹک پارٹی نے ۴۱۸ نشستیں جیت لیں"۔

عدنان مندریس کو کامیاب ہونے کے بعد اپنے وہ وعدے پورے کرنے پڑے جو اس نے انتخابی مہم کے دوران عوام سے کیے تھے۔ اس نے کابینہ کے پہلے اجلاس میں جو یکم رمضان کو منعقد ہوا ترکی عوام کو رمضان المبارک کا یہ تحفہ پیش کر دیا کہ آج سے ترکی میں عربی زبان میں اذان ہوگی۔ لباس کی آزادی ہوگی، تعلیم قرآن کی آزادی ہوگی۔ اُن کے لیے حج بیت اللہ کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ عدنان مندریس نے بعض مساجد کی تعمیر بھی شروع کرا دی۔ ایا صوفیا کو تو وہ واگذار نہ کرا سکا۔ البتہ اُس نے یہ اجازت دے دی کہ اُس کی ڈیوڑھی میں نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ ترکی عوام کی خواہش کے مطابق ڈیموکریٹک پارٹی نے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کا آغاز بھی کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے۔ اب ری پبلکن پارٹی کے اندر مزید تنزل آگیا۔ اور اس کے صرف ۲۴ نمائندے کامیاب ہوئے۔ عدنان مندریس کی حکومت نے اس مرتبہ ایک قانون جاری کیا جس کی رُو سے اُس نے وہ تمام مساجد واپس لے لیں جو مصطفےٰ کمال پاشا کے عہد میں لوگوں کو فروخت کر دی گئی تھیں نیز عدنان مندریس نے ۲۰ مدارس ائمہ و خطباء کھولے۔ تین دینی تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کیے، اور سینکڑوں حفظِ قرآن کے مکتب جاری کر دیے۔ عدنان مندریس اس قدر ذہین لیڈر تھا کہ جس علاقے کے اندر وہ محسوس کرتا کہ اُس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے تو وہ عوام کے دل جیتنے کے لیے وہاں کسی مسجد

کا افتتاح کر دیتا۔ عصمت انونو نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن عدنان مندریس نے عرب دوستی کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے اسرائیلی مصنوعات کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ اور ۱۹۵۶ء میں اس نے اسرائیلی سفیر کو ترکی سے نکال دیا۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ ترکی کے اندر صنعت قائم کرنے کا بھی آغاز کیا۔ گو یہ آغاز غیر ملکی سرمایہ کے بل بوتے پر تھا۔

جمال گورسل کا فوجی انقلاب

ترکی فوج کے افسران نے محسوس کیا کہ اگر عدنان مندریس کی حکومت قائم رہی تو مصطفےٰ کمال پاشا کے لادینی اصول بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور وہی اسلامی رُوح پھر عود کر آئے گی، جس سے انہوں نے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ اس امر کا احساس نہ صرف فوجی افسران کو ہوا بلکہ مغربی طاقتوں نے بھی اس خطرے کو شدت سے بھانپ لیا۔ چنانچہ جمال گورسل کی قیادت میں ترکی فوج نے ۱۹۶۲ء میں انقلاب برپا کر دیا۔ عدنان مندریس اور ان کے ساتھیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں وزیر خارجہ فطین زورلو بھی تھے جو ترک عرب اتحاد کے سرگرم حامی تھے۔

۱۹۶۰ء کا سال اسلامی تحریک کے لیے نہایت اہم سال ہے۔ کیونکہ اسلامی تحریک کی تاریخ میں یہ ایک نئے اور اہم دور کی کلید بن کر آیا۔ ترکی فوج جن عزائم اور منصوبوں کو لے کر آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ سب اُلٹ کر رکھ دیے۔ انقلابی حکمرانوں نے ایک طرف دُنیا کو یہ تصوّر دینا چاہا کہ وہ جمہوریت اور انسانی آزادی کے خلاف نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف انہوں نے عدنان مندریس کے دور میں اُبھر آنے والے اسلامی اثرات اور سعید نورسی کی دعوت سے اُٹھنے والی کرنوں کو محو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی رُو سے انہوں نے نیا قانون جاری کیا۔ جس میں نشر و اشاعت کی آزادی دی گئی جو اس سے پہلے بالکل مفقود تھی۔ اس آزادی سے اُن کے پیش نظر بائیں بازو کے عناصر کو یہ موقع فراہم کرنا تھا کہ وہ ملحدانہ اور گمراہ کُن لٹریچر کے ذریعے ملک کے اندر ایسی فکری تحریک برپا کریں جو اسلامی بیداری کی ہر علامت کا قلع قمع کر دے۔

چنانچہ بالفعل ایسا ہی ہوا۔ پریس کے یہ قوانین نافذ ہوتے ہی سرزمین ترکی کے اندر لینن، مارکس اور دوسرے ائمہ ضلالت کی کتابوں کی بارش ہونے لگی۔ ان کتابوں نے خاص طور پر طلباء کے اندر بائیں بازو کے نظریات کا طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹۶۴ء تک یہ عناصر اس قدر طاقتور ہو گئے کہ قریب قریب ترکی کی یونیورسٹیاں اُن کی گرفت میں آگئیں۔ (باقی)

رسائل و مسائل

اسلام اور جمہوریت پر سوالات

(۲)

سوال:-

جمہوریت کو مغربی نظامِ سیاست کی بنیاد کہا جاتا ہے اور جمہوریت کا اصل الاصول یہ ہے کہ مملکت کے تمام اُمور اکثریت کی رائے سے طے ہوں یعنی جمہوریت اکثریت کو اس امر کے فیصلے کا غیر مشروط اور لامحدود اختیار دیتی ہے کہ حق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کیا آپ اس اصل الاصول کو اسلامی ریاست کے مقصد، منشا اور مزاج کے مطابق قرار دیتے ہیں۔

جواب:-

جی نہیں! کوئی بھی ریاست جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور جس میں آخری فیصلے کا انحصار قانونِ الٰہی پر نہ ہو، وہ اسلامی ریاست نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ صحیح اسلامی اساسیات پر جو ریاست استوار ہو اس میں حاکمیت الٰہی کے دائرے میں اور قانونِ شریعت کے تحت اکثریت ہی کی رائے سے فیصلے ہونے چاہئیں، ورنہ کئی طرح کے بگاڑ پیدا ہوں گے۔

سوال:-

قرآن مجید اور حدیث رسول ؐ نے جو اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں، کسی مستقل نظامِ سیاست وحکومت کو اپنانا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔ لہٰذا بہت سے علماء منکرین جمہوریت کو اسلامی ریاست کے لیے قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس

ایسے مدبر و مفکر بھی ہیں جو اس تصور کو قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب :-

میرے نزدیک اسلام کے اصولِ حکمرانی معین ہیں۔ بنیادی دستوری اصول مقرر ہیں، البتہ سیاسی مشینری اور ڈھانچے کو حسب حال ادلا بدلا جا سکتا ہے۔ اور نئی شکلیں بھی ایجاد کی جاسکتی ہیں جمہوریت کی بحث بجائے خود ایک الگ بحث ہے۔ اسلام جس مساوات و اخوت کا نقیب ہے، سیاست میں اس کا نتیجہ کسی نہ کسی طرح کی جمہوریت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مگر مغربی جمہوریت اصول و اساس کے اعتبار سے اسلام سے تضاد رکھتی ہے۔ اصول و اساس بدل دیں تو ڈھانچہ کام دے سکتا ہے۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست نے اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے لیے ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا یکساں حق دیا ہے۔ گویا ایک عالم، ایک بے علم، ایک ماہر اور ایک غیر ماہر ایک نیکوکار اور غلط کار کی رائے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ کیا آپ اس مشروط بالغ حق رائے دہی کو اسلامی ریاست کے لیے قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔

جواب :-

بالکل غیر مشروط بالغ رائے دہی تو آج بھی کہیں نہیں ہے۔ البتہ فرق و امتیاز کسی اسلامی اساس پر نہیں ہے۔ آپ کوئی دوسری مناسب کسوٹیاں مقرر کر سکتے ہیں اور پابندیاں لگا سکتے ہیں۔

مگر سوال میں دو باتیں گڈمڈ ہیں۔ ایک ہے رائے عام اور ووٹر کی تربیت کا کام جو افراد، جماعتوں اداروں، تعلیم گاہوں، اخبارات، خطبات مساجد اور حکومتی وسائل سے مسلسل ہوتے رہنا چاہیے۔ خاص طور پر دینی گروہوں اور سیاسی پارٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی تربیت کریں۔ دوسری چیز ہے ادارات اور قانون کے ذریعے جبری امتیازات قائم کر کے انہیں منوانا۔ یہ ہتھیار صرف چند اہم اور ناگزیر صورتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسے کسی کے سابق مجرم ہونے، کسی دوسری صورت میں سزا یافتہ ہونے اور بعض فرائض کا تارک یا محرمات کا مرتکب ہونے کی صورت میں کچھ دوٹوک سے عام اصول بن جائیں۔ بقیہ امور میں آپ کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس گراں بہا تحقیق سے باخبر ہونا چاہیے کہ عدالتوں اور قانونی اداروں اور سیاسی ہیئتوں کے سامنے اعلیٰ سے

اعلیٰ عالم و متقی اور ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان (جب تک وہ مسلمان ہے) کا مرتبہ یکساں ہو گا۔ مدعی حضرت علی ہوں اور بیٹے یا غلام کے علاوہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکیں تو اُن کا ایمانی مرتبہ اور مقامِ علم و تقویٰ عدالت سے اُن کے حق میں فیصلہ نہیں دلوا سکے گا۔ یہی حال تمام اجتماعی ادارات کا ہے[1]۔ یہ تصور عجیب و غریب سا ہے کہ آیا ایک ایک فرد کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اتنی تفصیلات جمع کی جا سکتی ہیں کہ اُسے آپ کے پیش نظر معیارِ علم و تقویٰ کے لحاظ سے برتر تسلیم کیا جائے۔ کون لوگ سرٹیفکیٹ دیں گے؟ کیا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی رشوت نہیں دی جا سکتی؟ تعلقات اور سفارشوں کا دخل نہیں ہو سکتا؟ پھر کیا ہر گریجویٹ کو قابل و ماہر سمجھا جائے گا اور ہر مصلی و صائم کو متقی ——— خواہ اس کا تصورِ دین بنیادی ہی سے صوفیانہ ہو؟ کون ایک ایک فرد کے متعلق گواہی دے گا کہ آیا فی نفسہٖ اس کا تصورِ دین و تقویٰ درست ہے اور یہ اُسی کے مطابق سرگرم عمل بھی ہے؟ اور پھر کیا ہر ووٹر کے ووٹ کی قدر و قیمت بھی کارڈ پر درج ہو گی کہ اس کا ۱ ووٹ مساوی ہے ۱۳ ووٹوں کے، یا ۸۰ ووٹوں کے؟

سیدھی سی بات ہے کہ قانون صرف موٹی موٹی شرائط و تحدیدات لگا سکتا ہے۔ بقیہ سارا کام ان قوتوں کو کرنا ہے جن کی ذمہ داری تربیتِ عوام ہے۔ اگر رائے عامہ کی تربیت کرنے والے موجود نہ ہوں، یا کمزور رہوں، یا اُن کی محنتوں کے باوجود عوام کی ذہنی و اخلاقی تعمیر نہ کی جا سکے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ ایک قوم اپنی مرضی سے تباہی کی طرف جانا چاہتی ہے۔ موقع ملے تو اُسے جبریت کے ذریعہ اُس وقت تک روکیے، جب تک کہ اُسے روکا جا سکے۔ اور جبریت کے لیے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ

---

[1] کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ، راشن کارڈ یا ایکسپورٹ امپورٹ لائسنس، یا سرکاری انتظام سے تقسیم ہونے والے پلاٹ یا مکان یا دکانیں صرف متقی افراد کو ملا کریں، یا جو لوگ بھی ثابت کر دیں کہ وہ ایمان و علم و تقویٰ میں دوسروں سے برتر ہیں۔ اور مختلف سرکاری عہدوں اور نوکریوں اور راشن ڈپوؤں وغیرہ کے معاملے تو اور بھی اہم ہوں گے، بلکہ کل کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور گاڑی کی ریزرویشن بھی ترجیحاً نیک لوگوں کو ملنی چاہیے۔

کہاں تک اسلامی ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ " ترکستان جانے والے کے آگے کوئی حساس اور قوی شخص آکر کھڑا ہو گیا کہ ادھر نہیں جانا ہے، کعبے کی طرف جانا ہے۔ یہ وقتی تدبیر ہے، اصل علاج نہیں۔ اصل علاج تعلیمِ عوام اور تربیتِ عوام ہے۔ مَیں نے تبلیغ کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ اس کا مفہوم سکڑ کر ایک خاص شکل اختیار کر گیا ہے آج جو لوگ اس قسم کی بحثیں اُٹھا رہے ہیں، تربیتِ عوام کی اصل ذمہ داری سے بیشتر فرار کردہ عناصر ہیں۔ مدتوں سے یہ اصل کام چھوڑ چکے ہیں لہٰذا اب اُن کی سوچ بیچارہ یہی کچھ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عصا مردے از غیب ایسا نمودار ہو جائے جس کو اسلام سے کسی شکل میں دلبستگی ہو تو بس وہ معاشرے کو کوٹ پیٹ کر اسلامی بنا دے۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت ہمارے ہاں دُور دُور تک پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی سچا داعیٔ اسلام موجود ہو تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ اگر خدا پرستی، توحید، محبتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حکمتِ قرآن کی نورانیت کی دعوت دے کر لوگوں پر اثر ڈالا جا سکتا ہے تو معیارِ قیادت اور انتخابات کے لیے بھی مناسب تربیت دی جا سکتی ہے۔

مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کا تصورِ تقویٰ ایک حد تک بگڑا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر مَیں ہر نمازی کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں، لیکن معاشرے کے عوام بلکہ ذہین عناصر کا بھی خیال یہ ہے کہ جب متقی لوگوں کی بات کی جاتی ہے تو ہر نمازی، ہر ڈاڑھی والا، ہر امام مسجد، ہر مؤذن، ہر مدرس اور ہر واعظ اس گروہ میں آتا ہے، جب کہ اپنے علم و مطالعہ اور اپنے عملی رویے اور معاملات اور اجتماعی نصب العین کی محبت کے لحاظ سے اس گروہ سے باہر کے کئی لوگ کم تر نہیں ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کی " فارم " کو پورا نہیں کرتے۔ اس طرح بہت سے لوگ مُضیا کریسی اور مُلّا کریسی کے کابوس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم مروجہ اصطلاح کے لحاظ سے تمام متقیوں کو چُن کر حکومت کے مناصب تک لے جائیں تو چند دنوں میں اسلامی نظام کے حسین خواب کے پرزے اُڑ جائیں گے، کیونکہ امام اور واعظ تو کجا، ہر مفسر اور محدث تک کو نظامِ حکومت اور عملی سیاست اور جدید دَور کے مسائل اور اُن کے مختلف اچھے اور بُرے حل معلوم نہیں، ہیں تو ماہرانہ حد تک تو بالکل نہیں۔

پس اس وقت اگر کام چل سکتا ہے تو متقی کی اصطلاح کے معروف مفہوم کو تبدیل کر کے

اسے ایسی شکل دینی ہوگی کہ ایک طرف اس کے دائرے میں ایسے جدید تعلیم یافتہ اور ماہرِ امور سیاست و معیشت داخل ہو سکیں جو ایمانی اور مقصدی اور اخلاقی لحاظ سے اگر بہت اعلیٰ مقام پر نہیں تو کم سے کم بقدرِ ضرورت قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ دوسری طرف ایسے علماء یا مذہبی طبقوں کے افراد کو لیا جا سکتا ہے جو جدید مسائل اور سیاسی احوال و ظروف کے متعلق بصیرت رکھنے کے ساتھ ایسے کشادہ ظرف بھی ہوں کہ وہ تھوڑے بہت اختلافات رکھنے والوں کے ساتھ مل کے چل سکیں۔ اہمیت ہمیں ان شخصیتوں کو دینی چاہیے جو بیک وقت دونوں طرح کی ماہرانہ واقفیت کے ساتھ اچھا کردار رکھتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس دور میں حکومت چلا سکیں گے اور ایسے لوگوں میں ہمیں ایمان و اسلام کی اساسیات کے ساتھ جن دو چیزوں کو دیکھنا چاہیے وہ ہیں بصیرت اور امانت۔ اور ایسے مردانِ کار کی چھانٹ پرکھ معاشرے ہی سے کرانی ہوگی تاکہ وہ نئی قیادت کا احترام کرے اور اُن کی اتھارٹی تسلیم کرے۔

عملی تدبیر اصلاح کے طور پر میں اس گفتگو کے آخر میں یہ رائے دیتا ہوں کہ امیدوارانِ انتخاب (یا نامزد نمائندوں) کے لیے آپ نسبتہً سخت اور واضح معیار رکھیے۔ اس تھوڑی تعداد کی چھنٹائی زیادہ آسان ہے۔ بعد ازاں آپ کابینہ یا صدر یا وزیراعظم کے لیے تدریجاً مزید اور معیارات رکھ سکتے ہیں۔ یہی بہترین قابلِ عمل طریقہ اصلاح ہے۔

سوال:۔

اگر آپ مغربی نظامِ سیاست کو اسلامی اُصولوں سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے تو آپ کی رائے میں اسلامی نظامِ سیاست کے خد و خال کیا ہونے چاہییں؟

جواب:۔

برادرِ من! مصیبت یہ ہوئی کہ دورِ رحمت و خلافت میں تو تحریک کے اُبھارے ہوئے لیڈر بغیر کسی غیر معمولی اہتمام کے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ بعد میں ملوکیت آگئی اور یہ ہیئت سیاسیہ اسلامی نہیں تھی۔ اس کے تحت رہتے ہوئے جن مصنّفین نے علم السیاست پر لکھا، انہوں نے بھی فقط امیر اور ارکانِ شوریٰ کے اوصاف کی فہرستیں بنانے پر اکتفا کیا۔ کسی ماہر نے اسلامی نظامِ حکومت کے لیے کوئی مشینری نہیں سوچی۔ نتیجہ یہ کہ آج تک کے علمائے دین کے پاس وہی اوصاف کا پیمانہ ہے،

مشینری کا کوئی تصور نہیں۔ علمی و فکری لحاظ سے یہ ہماری بڑی فروماٸیگی ہے۔

میرے نزدیک نہایت سنجیدہ فضا میں جمع ہونے والے انتہائی دیانت دار ۳۱ علماء کا اجماع (۱۹۵۱ء) ہی ایک ایسا خاکہ دیتا ہے جس پر موجودہ دور میں کام کیا جاسکتا ہے۔ (ان علماء کا خاکہ جن اصولوں پر مبنی ہے وہ اسی شمارے میں دیے جارہے ہیں)

ہاں! تجربات کے بعد، آگے چل کر مزید بہتری پیدا کی جاسکتی ہو تو کی جائے۔ کام چلانے کے لیے بہت اچھا بلیو پرنٹ ہمارے پاس موجود ہے۔

سوال:- مغربی جمہوریت نے ہر بالغ شہری کو ووٹ دہی کا حق دیا ہے۔ اسلام میں ووٹ کے لیے بھی تقویٰ معیار ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب:-

میرا جواب اوپر کے معروضات سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے، مزید یہ کہ میں اس کے لیے ۵۱ء کے اجماع علماء کے ۲۲ اصولوں ہی کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

آپ تمام شہریوں کو (یا اُن کی بھاری اکثریت کو) یہ کہہ کر امورِ حکومت و سیاست سے الگ نہیں رکھ سکتے کہ تم چونکہ جاہل اور غیر متقی ہو، لہٰذا تمہیں رائے دینے کا حق نہیں۔ آخر حکومت انہی پر چلائی جانی ہے اور انہی کے تعاون سے چل سکتی ہے۔ یہ کام اُن کو اعتماد میں لیے بغیر ممکن نہیں۔

۔ آج آبادی کی وہ نوعیت نہیں کہ تھوڑے سے افراد ہوں اور ہر علاقے اور ہر قبیلے میں فرد فرد کے احوال پر پوری نظر ہو، یہاں تو ۸ کروڑ آبادی کا ہجوم ہے، اِن کے بالغ افراد کی رایوں، معمولات، رجحانات کی تربیت کرنا اور اُن کو سمجھنا آسان نہیں ہے، تاہم اِن کو دورِ جدید کے اُن نظریاتی فتنوں سے بچا سکتے ہیں جو پریس اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے بارش کی طرح ہر آن برستے ہیں۔ پھر اگر یہ بگڑ جائیں اور کہیں شورش اٹھا دیں تو آج معاملہ اس حد تک محدود نہیں ہے، جس حد تک سیدنا حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں تھا کہ تحریکِ ارتداد اور مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف آپ نے قوت کی کمی کے باوجود پورا معرکہ لڑا، اور ان منفی شورشوں کی سرکوبی کر دی۔

بہرحال میرے نزدیک ارکانِ شوریٰ کا چناؤ ہونا چاہیے اور اس چناؤ کے لیے دنیا بھر کے تجربات کو سامنے رکھ کر ان کے غلط پہلوؤں کو ساقط کر دیا جائے اور صحیح پہلوؤں کو لے لیا جائے، جو بھی صورت ہو، ارکانِ شوریٰ کا انتخاب ہونا چاہیے ——— اور انتخاب بھی انتخاب عام !

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں سیاسی جماعتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور حزبِ اختلاف کا وجود اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے ۔ آپ کی رائے کیا ہے ؟

جواب :-

میں مدت العمر سے سیاسی پارٹیوں کے وجود کے حق میں ہوں، کیونکہ یہ بکھرے ہوئے افراد کو منظم کرنے، اُن کو دینی شعور اور سیاسی تربیت دینے کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک پارٹیاں اگر مخالفت برائے مخالفت کے اُصول پر منظم نہ کی جائیں تو وحدتِ ملت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ پارٹیاں شعورِ وحدت کو بڑھانے میں مدد دیتی ہیں ۔ خود مسلم لیگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو خاص طرح کا شعور دلایا تھا، کیا وہ پارٹی نہ ہونے کی صورت میں بھی پھیل جاتا ۔ اور لوگوں میں منظم تحریک پیدا ہو جاتی ؟

پارٹیاں اس لحاظ سے بھی ضروری ہیں کہ وہ عام شہریوں کو بے جا شورش پسندی اور تخریب اور انتشار کے خطرات سے بچا کر اُن کی سرگرمیوں کو آئینی راستوں پر ڈالتی ہیں ۔ تخریب پسند اور ہنگامہ خیز پارٹیوں کو میں سیاسی پارٹیوں کی حیثیت میں زیرِ غور نہیں لا رہا ۔

اس مسئلے پر میں چونکہ تفصیل سے جون کے اشارات میں لکھ چکا ہوں، اس وجہ سے ساری باتیں دوہرانا مشکل ہے ۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں انتظامیہ اور مقننہ کا دائرہ الگ الگ ہوتا ہے ۔ کیا انتظامیہ اور مقننہ کی یہ تفریق اسلامی نظامِ سیاست کے لیے ضروری ہے ۔

جواب :-

جی ہاں ! اگر آپ اپنی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کریں تو خلیفہء اوّل کے دَور میں یہ واقعہ آپ کے سامنے آئے گا کہ انہوں نے ایک شخص کو جاگیر کا عطا نامہ لکھ دیا - پھر وہ حضرت عمرؓ (اُس دَور کے عدلیہ کے سربراہ) کے سامنے توثیق کے لیے پیش ہوا - انہوں نے حضرت کے عطا نامے کو درست نہ سمجھتے ہوئے اُسے کالعدم قرار دے دیا - وہ شخص پھر خلیفہ کے پاس گیا - انہوں نے حضرت عمرؓ کے فیصلے کو برقرار رکھا -

نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیغمبرانہ شان بھی اور تھی ، اور شروع میں کام بھی محدود تھا - اور معاشرہ نہایت صالح اور اطاعت گزار - بعد میں رجسٹر بنے ، دیوان بنے ، دفتر کھُلے ، قید خانے بنے ، عدلیہ کا شعبہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا - آپ ذرا " قضا اور ادب القاضی" کے ابواب احادیث اور فقہی لٹریچر میں نکال کر دیکھیں -

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں سربراہ مملکت کا انتخاب براہ راست بھی ہوتا ہے اور بالواسطہ بھی - آپ کیا طریق کار تجویز کریں گے ؟

جواب :-

میرے نزدیک کسی بھی طریقے کو ضروری اصلاحات اور احتیاطوں کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے - ضروری یہ ہے کہ بپیشِ نظر ملک اور معاشرے کو دیکھا جائے کہ اس کے حالات میں کونسی صورت آسان اور بہتر رہے گی -

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست ایک معینہ مدّت کے بعد ، حکومت اور مجالس قانون ساز کا دوبارہ انتخاب ضروری قرار دیتا ہے - خلفائے راشدین اور عصر حاضر سے پہلے ، اسلامی تاریخ کے دوسرے ادوار میں ہمیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی -

جواب :- بعد کے دَور کی مثال کو تو اصولی فیصلوں کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا ، خود خلفائے راشدین کے ہاں ایسی کوئی اصولی بات نہیں ملتی ہے کہ جو شخص مقرر ہو وہ لازماً مدّت العمر کے لیے مقرر ہو ، نہ

کوئی نص (کتاب وسنت میں) ایسی ہے کہ کسی امیر یا رکن شوریٰ کو دائمی طور پر جمے رہنا چاہیے۔

"دائمی امارت" کے تصوّر کو خواہ مخواہ کا اسلامی اصول بنا کر اس پر فتوے دینا کوئی صحیح صورت نہیں۔

حرفِ آخر!

ان مسائل پر بعض اطراف سے فتووں کے مزاج کی تحریریں آ رہی ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سوالوں کو حکمتِ اجتماعیات (SOCIALOGY) کی روشنی میں رکھ کر دیکھا جائے اور اجتماعیات کے بدلتے ہوئے احوال وظروف کو سمجھا جائے۔ احتیاط بس یہ کرنی چاہیے کہ نصوص سے انحراف یا تجاوز نہ ہونے پائے۔ سیاسی ہیئت کے معاملے میں نصوص صرف "حدودِ اربعہ" کے سے نشان لگاتی ہیں، ان نشانات کے اندر مباحات کا بڑا دائرہ سوچ بچار کے لیے موجود ہے۔ اس دائرے کو خواہ مخواہ تنگ کرنے سے پیچیدگیاں بڑھتی جائیں گی۔ (ن ص)

اِسلامی مملکت کے بُنیادی اُصول

۲۲ دستوری اُصول جنہیں ۳۱ ممتاز علماء نے جنوری ۱۹۵۱ء میں متفقہ طور پر طے کیا

۱۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲۔ ملک کا قانون کتاب و سنّت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو،

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنّت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدّت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق کر دیے جائیں گے۔

۳۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں، بلکہ ان اُصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جس کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنّت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوّت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے اُبھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷ — باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸ — مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعِ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹ — مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے اُن کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ — غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱ — غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں گے ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے، ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲ — رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے، جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا اُن کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳ — رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جز کسی فرد یا جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

۱۴ — رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵ —— رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کُلاً یا جزءاً معطل کرکے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶ —— جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی، وہی کثرتِ آراء سے اُسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷ —— رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸ —— ارکان و عمّالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹ —— محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰ —— ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی، جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اُصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱ —— ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاءِ انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲ —— دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو۔

---

۳۱ علمائے کرام کے اسمائے گرامی

۱ —— مولانا سیّد سلیمان ندوی صدر مجلس

۲ —— مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی - امیر جماعتِ اسلامی پاکستان

۳ —— مولانا مفتی محمد شفیع - ممبر بورڈ تعلیماتِ اسلامیہ۔

۴ — مولانا مفتی جعفر حسین مجتہد - ممبر بورڈ تعلیمات اسلامیہ -

۵ — پروفیسر عبد الخالق - ممبر بورڈ تعلیمات اسلامیہ -

۶ — مولانا محمد ظفر احمد انصاری - سیکرٹری بورڈ تعلیمات اسلامیہ -

۷ — مولانا شمس الحق افغانی - وزیر امور مذہبی - قلات سٹیٹ -

۸ — مولانا احتشام الحق - مہتمم دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ -

۹ — مولانا بدر عالم - صدر حدیث ڈیپارٹمنٹ دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ -

۱۰ — مولانا محمد یوسف بنوری - شیخ التفسیر دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ -

۱۱ — مولانا محمد عبد الحمید قادری بدایونی - صدر جمعیت علمائے پاکستان سندھ -

۱۲ — مولانا محمد ادریس - شیخ الجامعہ - جامعہ عباسیہ بہاول پور -

۱۳ — مولانا خیر محمد مہتمم مدرسہ خیر المدارس، ملتان -

۱۴ — مولانا مفتی محمد حسن مہتمم مدرسہ اشرفیہ لاہور

۱۵ — پیر صاحب محمد امین الحسنات پیر مانکی شریف -

۱۶ — حاجی خادم الاسلام محمد امین - خلیفہ حاجی ترنگ زئی - پشاور -

۱۷ — مولانا عبد الصمد سربازی - قاضی قلات سٹیٹ -

۱۸ — مولانا اطہر علی - صدر عامل جمعیت علمائے اسلام مغربی پاکستان -

۱۹ — مولانا ابو جعفر محمد صالح - امیر جمعیت حزب اللہ مغربی پاکستان -

۲۰ — مولانا راغب احسن - نائب صدر جمعیت علمائے اسلام، مغربی پاکستان -

۲۱ — مولانا محمد حبیب الرحمٰن نائب صدر جمعیت المدرسین، سرسینہ شریف مغربی پاکستان -

۲۲ — مولانا محمد علی جالندھری مجلسِ احرار اسلام پاکستان -

۲۳ — مولانا سید محمد داؤد غزنوی - صدر جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان -

۲۴ — مولانا مفتی حافظ کفایت حسین - مجتہد ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعیانِ پاکستان -

۲۵ — مولانا محمد اسماعیل - ناظم جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان -

۲۶ — مولانا حبیب اللہ - جامعہ دینیہ دار الہدیٰ - ٹیری -

۲۷ ـــــ مولانا احمد علی - امیر انجمن خدام الدین - لاہور

۲۸ ـــــ مولانا محمد صادق - مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کراچی

۲۹ ـــــ مولانا شمس الحق فرید پوری - صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ۔

۳۰ ـــــ مولانا مفتی محمد صاحب داد سندھ، مدرسۃ الاسلام - کراچی۔

۳۱ ـــــ پیر صاحب محمد ہاشم مجددی ٹنڈو سین داد سندھ۔

(ان میں خاصی تعداد وفات پا چکی ہے - خدا اُن پر رحمت فرمائے)

چند تصحیحات (بسلسلہ شمارہ جون)

خواجہ غفور احمد صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انہوں نے شمارہ جون میں درج شدہ آیات کی تصحیح کے لیے توجہ دلائی - قارئین حسب ذیل مقامات کی اصلاح فرمالیں:۔

۱ـــ سورۂ یونس کی آیت ۶۱ (مندرجہ ص ۴۲/۱۶۶) صحیح صورت یوں ہے وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ۔

۲ـــ سورۂ مائدہ کی آیت ۳ (مندرجہ ص ۴۳/۱۷۴) میں "اَكَلَ السَّبُعَ" کے بجائے "اَكَلَ السَّبُعُ" ہونا چاہیے۔

۳ـــ سورۂ مائدہ کی آیت ۲۶ (مندرجہ ص ۴۲/۱۷۶) میں لفظ "سِنَةً" کے بجائے "سَنَةً" ہونا چاہیے۔

۴ـــ سورۂ الحجرات کی آیت ۲ (مندرجہ ص ۴۳/۱۷۷: سطر ۱۱) میں لفظ "نَحْبِطَ" کو "تَحْبَطَ" ہونا چاہیے - نیز لفظ "لَا تَعْلَمُونَ" کے بجائے "لَا تَشْعُرُونَ" ہونا چاہیے۔

راقم اِن غلطیوں پر بھی اور زندگی کی تمام دوسری غلطیوں پر بھی خدا سے طالبِ عفو و غفران ہے۔

نعیم صدیقی (مرتب)

ضروری اعلان

ادارہ ترجمان القرآن نے رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں مندرجہ ذیل

کتابوں پر خصوصی رعایت دینے کا فیصلہ کیا ہے

پارہ اول تفہیم القرآن	۶/۵۰	روپے
سورۃ الفاتحہ	۹/-	〃
سورۃ النساء	۶/۲۵	〃
سورۃ الفرقان	۳/-	〃
سورۃ العنکبوت	۳/۵۰	
سورۃ الاحزاب	۶/۵۰	
سورۃ یٰس	۳/-	〃
سورۃ الفتح	۳/-	〃
سورۃ الحجرات	۳/-	〃
سورۃ الرحمٰن	۳/-	〃
سورۃ لقمان	۳/-	〃
تیسواں پارہ	۲۰/-	〃
میزان	۶۹/۷۵	روپے
رعایتی قیمت	۴۵/-	روپے

بنیادی حقوق DeLux قیمت ۲۷/- روپے رعایتی قیمت ۱۶/- روپے

بنیادی حقوق P.B 〃 ۲۰/- 〃 ۱۲/- 〃

ادارہ ترجمان القرآن — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵

اگست ۱۹۸۱ء

خطباتِ یورپ

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

- تازہ ترین مواد کے ساتھ تازہ ترین کتاب.....
- یورپ میں اسلام کا مستقبل اور مستقبل کے یورپ کے اسلامی نقوش
- یورپ کی مادہ پرستانہ جاہلیت کے اندھیروں میں اسلام کی روشنی کا مینار
- دورِ حاضر کے چیلنج کا اسلام کی طرف سے مسکت جواب
- صلیبی جنگوں کے تعصبات کی بیماری کا شافی علاج
- اسلام کے خلاف صدیوں سے پھیلنے والے گمراہ کن گرد و غبار کی صفائی
- غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کا طریقہ اور سلیقہ

ضخامت : ۲۵۶

سائز : ۲۲ × ۱۸ / ۸

قیمت : ۲۴/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن ○ اچھرہ۔ لاہور